سہ ماہی

صالحات

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر: نعیم احمد بلوچ

جلد:2 شمارہ:1 جولائی - ستمبر 2025ء

علم و آگہی اور شعور و تربیت

جس ہستی کا حال یہ رہا ہو کہ ۲۵ سال کی ابتدائی زندگی میں کوئی شخص اُس کی سیرت و کردار پر حرف لانے کی جسارت نہ کر سکا؛ جس نے بھرپور جوانی میں شادی کی تو وہ بھی ایک ایسی خاتون سے جو بیوہ اور بچوں والی تھی؛ جس نے عرب کے معاشرے میں، جہاں تعدد ازواج کا عام رواج تھا، کم و بیش ۲۵ سال اِسی ایک خاتون کی رفاقت میں گزار دیے اور کبھی دوسری شادی کا سوچا تک نہیں؛ جس نے دوسرا نکاح کیا تو اُس کے انتقال کے بعد اور وہ بھی ایک پچاس سال کی بیوہ خاتون سے اور جس نے پوری زندگی میں ایک ہی باکرہ خاتون سے شادی کی اور اُس کی رخصتی کو بھی کئی برس تک موخر کیے رکھا تاکہ بڑی عمر کی جس خاتون کو گھر در کی ذمہ داریوں کے لیے لے آیا گیا ہے، اُس کو عدم التفات کی شکایت نہ ہو، اُس کے بارے میں صرف ایک بیمار ذہن کا شخص ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ پچپن سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اُسے اچانک شادیوں کا ہَوکا ہو گیا تھا اور اپنی خواہشِ نفس کی تسکین کے لیے اُس نے اپنے ہی بنائے ہوئے قانون میں ترمیم کی اور ایک کے بعد دوسری عورت سے نکاح کرنا شروع کر دیے تھے۔

(ازواج مطہرات)

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

علم و آگہی اور شعور و تربیت

سہ ماہی

صالحات

خواتین کے لیے

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

نگران: حسن الیاس

جلد: 2 شمارہ: 1 جولائی - ستمبر 2025ء

مدیر: نعیم احمد بلوچ نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

مجلس ادارت

ارم نبی، بینش سلیم، ثوبیہ نورین، غزل چودھری، نکہت ستار

مجلس مشاورت

کوکب شہزاد، منیزہ ہاشمی، نسرین آفتاب، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر عظمیٰ عثمان

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

سہ ماہی
صالحات
خواتین کے لیے

علم و آگہی اور شعور و تربیت

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی
نگران: حسن الیاس

مدیر: نعیم احمد بلوچ

فہرست مضامین

1۔ بیوی کو جسمانی سزا اور قرآن	استاد جاوید احمد غامدی	04
2۔ توہم پرستی	محمد حسن الیاس	09
3۔ عالم بے بسی کا!	نعیم احمد بلوچ	11
4۔ ازواجِ مطہرات	جاوید احمد غامدی	14
5۔ استاد کبھی نہیں ڈانٹتا	محمد حسن الیاس	19
6۔ مردانگی	نعیم احمد بلوچ	22
7۔ دروازہ جو اندر کھلتا ہے	محمد حسن الیاس	29
8۔ ایمان بالغیب کیا ہے؟	کلثوم ثاقب	33
9۔ ہماری صحت ہماری ذمہ داری	بینش رمان کھرل	37
10۔ بیٹوں کی تربیت اور چند سنگین مسائل	ثوبیہ نورین	44
11۔ کیا بتائیں اور کیا نہ بتائیں؟	نورین شیخ	48
12۔ کمال یہ ہے	مبارک صدیقی	50
13۔ Boundaries of the Soul	نسرین خان	52
14۔ اڑان	ثوبیہ نورین	55
15۔ نامے جو میرے نام آئے!	وجیہہ حسان واحدی	58

تعلیم القرآن

استاد جاوید احمد غامدی

بیوی کو جسمانی سزا اور قرآن

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ﴿النساء: ۳۴﴾

ترجمہ

اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انھیں نصیحت کرو اور اُن کے بستروں پر اُنھیں تنہا چھوڑ دو اور (اِس پر بھی نہ مانیں تو) اُنھیں سزا دو۔ پھر اگر وہ تمھاری بات ماننے لگیں تو اُن پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک، اللہ بہت بلند ہے، وہ بہت بڑا ہے۔

تشریح

سورہ النساء کی آیت کے اس حصے میں اُن بیویوں سے معاملہ کرنے کی ہدایات دی گئی ہیں جو اپنے شوہروں سے سرکشی کا رویہ اختیار کر لیں۔ ہم یہاں مختلف مُفَسِّرین کی تشریح کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے

مولانا مودودی کے مطابق یہ آیت ایک نظامِ خانہ داری کی وضاحت کر رہی ہے، جس میں شوہر کو قوامیت (نگہبانی وانتظام) دی گئی ہے۔

"ادباً مارنے" کی اجازت صرف نافرمانی (نشوز) کی صورت میں دی گئی ہے، جب وعظ و نصیحت اور علاحدگی مؤثر نہ ہو۔

انہوں نے واضح کیا کہ یہ مارنا ظلم یا انتقام کی صورت نہ ہو، بلکہ آخری حد کے طور پر ہو، جو اصلاح کی نیت سے ہو۔
ان کے نزدیک یہ قانونی اختیار ہے، نہ کہ اخلاقی فضیلت ، اور حکمت و عدل کے دائرے میں رہ کر استعمال ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے

ڈاکٹر اسرار احمد اس آیت کو قوامیتِ مرد کے تسلسل میں دیکھتے ہیں۔
وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ "ضرب" (مارنے) کا مطلب محض علامتی مار ہے، جس میں کوئی جسمانی تکلیف یا ذلت کا پہلو نہ ہو۔
ان کے نزدیک یہ صرف تادیبی قدم ہے، نہ کہ غصے یا جذبات کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ۔
وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں کبھی بیوی کو ہاتھ نہیں لگایا، اور امت کو بھی اس سے منع کیا ہے، لہٰذا اس اجازت کا استعمال بہت ہی نرمی اور حکمت سے ہونا چاہیے۔

اہل حدیث مکتبِ فکر کی رائے

اہل حدیث علماء کے نزدیک یہ اجازت ایک شرعی حد ہے، جو اصلاحِ بیوی کی غرض سے، علامتی اور غیر مؤذی مار تک محدود ہے۔
کئی اہل حدیث مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ اس "مارنے" میں چہرے پر مارنے کی ممانعت اور نرمی کا پہلو شامل ہونا ضروری ہے، جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔
وہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ اقدام آخری مرحلہ ہونا چاہیے، اس سے پہلے نصیحت اور علیحدگی اختیار کی جائے۔

مفتی محمد شفیع عثمانیؒ (بحوالہ معارف القرآن)

دیوبندی نقطہ نظر کے جید عالم اور مفسر مفتی شفیع کے نزدیک "ضرب" کا مفہوم تادیب ہے نہ کہ تشدد۔
وہ فرماتے ہیں کہ یہ صرف نشوز (بغاوت یا نافرمانی) کی صورت میں جائز ہے، اور وہ بھی تین مراحل کے بعد
وعظ و نصیحت
بستر سے علاحدگی

ہلکی پھلکی مار (جس میں کوئی چوٹ یا زخم نہ آئے)

وہ حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا

"تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے بہترین ہو۔"

ان کے نزدیک یہ اجازت شوہر کی اصلاحی قوامیت کا حصہ ہے، ظلم یا تفوق کا اظہار نہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (تفسیر عثمانی)

علامہ عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ نے مرد کو قوام (نگہبان و منتظم) بنایا ہے، لیکن یہ قوامیت اخلاق و شفقت کے دائرے میں ہے۔

"ضرب" کا استعمال آخری مرحلے پر ہے اور اس میں بھی شرعی حدود کا لحاظ ضروری ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ نبی ﷺ کی سنت اور سیرت کو دیکھتے ہوئے اس اختیار کو علامتی، محدود، اور اخلاقی دائرے میں رکھنا لازم ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر شوہر اس اختیار میں ظلم کرے تو بیوی کو قاضی یا عدالت میں رجوع کا پورا حق حاصل ہے۔

جاوید احمد غامدی کی رائے

قرآن نے فرمایا ہے کہ صالح بیویوں کا رویہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ (کہ وہ رازوں کی حفاظت کرتی ہیں) اِس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو عورتیں سرکشی اور تمرّد اختیار کریں یا گھر کے راز دوسروں پر افشا کرتی پھریں، وہ خدا کی نگاہ میں ہرگز صالحات نہیں ہیں۔

لیکن کوئی عورت اگر اِس طرح کی سرکشی پر اتر ہی آئے تو مرد کیا اُس کی تادیب کر سکتا ہے؟ قرآن نے اِس کا جواب اثبات (ہاں) میں دیا ہے۔ آیۂ زیر بحث میں اِس سرکشی کے لیے "نشوز" لفظ آیا ہے۔ اِس کے معنی سر اٹھانے کے ہیں، مگر اِس کا زیادہ استعمال اُس سرکشی اور شوریدہ سری (بغاوت) کے لیے ہوتا ہے جو کسی عورت کی طرف سے اُس کے شوہر کے مقابل میں ظاہر ہو۔ یہ لفظ عورت کی ہر کوتاہی، غفلت یا بے پروائی یا اپنے ذوق اور رائے اور اپنی شخصیت کے اظہار کی فطری خواہش کے لیے نہیں بولا جاتا، بلکہ اُس رویے کے لیے بولا جاتا ہے، جب وہ شوہر کی قوامیت کو چیلنج کر کے گھر کے نظام کو بالکل تلپٹ کر دینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ معاملہ یہاں تک پہنچ رہا ہو تو مرد اپنا گھر بچانے کے لیے تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے، بلکہ اُسے کرنی چاہییں:

پہلی یہ کہ عورت کو نصیحت کی جائے۔ آیت میں اِس کے لیے 'وَعَظ' کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اِس میں کسی حد تک زجر و توبیخ (ڈانٹ) بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری یہ کہ اُس سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دیا جائے تاکہ اُسے اندازہ ہو کہ اُس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اِس کے نتائج غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ عورت کو جسمانی سزا دی جائے۔ یہ سزا، ظاہر ہے کہ اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر اِس کی حد 'غیر مبرح" کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کوئی اثر چھوڑے۔

آیت کے انداز بیان سے واضح ہے کہ اِن تینوں میں ترتیب و تدریج ملحوظ ہے۔ یعنی پہلی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری صورت اُسی وقت اختیار کرنی چاہیے، جب آدمی مطمئن ہو جائے کہ بات نہیں بنی اور اگلا قدم اٹھانے کے سوا چارہ نہیں رہا۔ مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ اگر اس سے اصلاح ہو جائے تو عورت کے خلاف انتقام کی راہیں نہیں ڈھونڈنی چاہییں۔ چنانچہ ان اللہ کان علیا کبیرا کے الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ سب سے بلند اور سب سے بڑا خدا ہے۔ وہ جب آسمان و زمین کا مالک ہو کر بندوں کی سرکشی سے درگذر فرماتا ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد نافرمانیوں کو معاف کر دیتا ہے تو اُس کے بندوں کو بھی دوسروں پر اختیار پا کر اپنے حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ (میزان)

اہم نکات

☆ یہ حکم "عورتوں" کے بارے نہیں بلکہ صرف بیویوں کے بارے میں ہے۔

☆ یہ حکم میاں بیوی میں عام گھریلو اختلاف اور تلخی کے وقت تو تکار کے بارے میں نہیں ہے۔

☆ میاں بیوی کے درمیان یہ سارے حقوق و فرائض اس بنیاد پر مقرر ہوئے ہیں جب اس میں مرد " قوّام "یعنی وہ بیوی بچوں اور گھر کے سارے اخراجات اور حفاظت کا ذمہ دار ہے یعنی گھر کے ادارے کا" سربراہ"اور" باس" ہے ۔ اگر اس میں تبدیلی آجائے اور بیوی بھی گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالنے لگے ، نان نفقے میں کسی حد تک معاون ہو جائے اور وہ نکاح کے معاہدے میں باہمی افہام و تفہیم سے تبدیلی کر لیں تو ظاہر ہے کہ حقوق و فرائض بھی اسی تبدیل شدہ معاہدے کی روشنی میں مقرر ہوں گے۔

اگر ملکی قانون ایسے ہیں کہ مرد کو کسی بھی صورت میں ضرب کی اجازت نہیں تو شوہر اس قانون پر عمل کرنے کے پابند ہوں گے۔ وہاں انھیں اس حق سے دستبردار ہونا پڑے گا جو ایک خاص طرح کی معاشرت میں انھیں شریعت نے دیا ہے۔ وہ اگر بیوی پر ہاتھ اٹھائیں گے تو قانون کے مطابق مجرم اور قابل سزا قرار پائیں گے۔ یاد رہے کہ اس وقت پاکستان سمیت اکثر ممالک میں یہ قوانین نافذ ہو چکے ہیں۔ اور ان ملکوں کے شوہر بیویوں کو نشوز پر جسمانی سزا نہیں دے سکتے۔ اور یہ شریعت کی خلاف ورزی بھی نہیں کہلائے گا۔ کیونکہ بیوی کی تادیب فرض نہیں بلکہ یہ محض ایک اختیاری تدبیر ہے جس کی اسے اجازت دی گئی ہے۔ اس کی حیثیت فرض کی ہرگز نہیں۔ اور جس ملک میں شوہر رہتا ہے اس کے قانون کی تعمیل اس پر فرض ہے۔

تسہیل و وضاحت: نعیم احمد بلوچ

ترجمہ و تحقیق: محمد حسن الیاس

توہم پرستی

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ السُّلَمِيِّ، قال: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، أُمُورًا كُنَّا نَصْنَعُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ، كُنَّا نَأْتِي الْكُهَّانَ، قَالَ: ''فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ''، قَال: قُلْتُ: كُنَّا نَتَطَيَّرُ، قَالَ: ''ذَاكَ شَيْءٌ يَجِدُهُ أَحَدُكُمْ فِي نَفْسِهِ، فَلَا يَصُدَّنَّكُمْ''، قَالَ: قُلْتُ: وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّونَ، قَالَ: ''كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ يَخُطُّ، فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ فَذَاكَ (صحیح مسلم، رقم ۱۴۰ء)

ترجمہ

معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ، ہم جاہلیت کے زمانے میں بعض کام کیا کرتے تھے۔ (اُنھی میں سے یہ بھی تھا کہ) ہم کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لیکن اب کاہنوں کے پاس مت جایا کرو۔'' کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ہم براشگون بھی لیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: یہ ایک خیال ہی ہوتا ہے جو تم میں سے کسی کے دل میں گزرتا ہے، مگر تمھیں یہ کسی کام سے روکے نہیں۔ میں نے عرض کیا: ہم میں سے کچھ لوگ خط بھی کھینچتے تھے۔ اِس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک نبی بھی خط کھینچا کرتے تھے۔ جس کا خط اُس کے موافق ہو جائے، وہ یہ خط کھینچ لے۔

تشریح

یہ علم رمل کا ذکر ہے، جس میں لکیروں اور ہندسوں کے ذریعے سے غیب کی باتیں بتانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ (نبی سے مراد حضرت مسیح علیہ السلام ہیں) غالباً اُسی طرح کا معجزہ تھا، جیسے مسیح علیہ السلام

نے اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ ”میں تمھیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھا کر آئے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو“ (آل عمران ۳:۴۹)۔

"جس کا خط اُس کے موافق ہو جائے، وہ یہ خط کھینچ لے۔" یہ زجر (تنبیہ) کا جملہ ہے اور زجر کے طریقے پر اثبات سے انکار کا اسلوب قرآن و حدیث میں بعض دوسرے مقامات پر بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ سورۂ حج (۲۲) کی آیت ۱۵ میں ’فَلۡيَمۡدُدۡ بِسَبَبٍ اِلَي السَّمَآءِ ثُمَّ لۡيَقۡطَعۡ‘۔

(اِنھیں بتاؤ کہ) جو یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں ہرگز اُس کی مدد نہ کرے گا۔ اُس کو چاہیے کہ (اپنے تصور میں ذرا) ایک رسی (اوپر چڑھنے کے لیے) آسمان کی طرف تانے، پھر (جب منزل کو بہت دور دیکھ کر رنجیدہ ہو تو) اُس کو کاٹ دے اور دیکھے کہ آیا اُس کی یہ تدبیر اُس کے رنج کو دور کرنے والی بنتی ہے؟

(حدیث میں) اِسی کی مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کوئی نبوت کے منصب پر فائز کر دیا گیا ہے تو یہ کر لے، اِس لیے کہ اِس طریقے سے غیب کی خبریں بتانے کا معجزہ ایک پیغمبر کو دیا گیا تھا اور معجزات پیغمبروں ہی کو دیے جاتے ہیں۔ کسی دوسرے کی طرف سے اِس طرح کے دعوے محض اوہام ہیں، جن سے دور ہی رہنا چاہیے۔

اسی مضمون کی دیگر متعدد روایات میں ایک دوسری روایت کچھ یوں ہے:

صفیہ بنت ابو عبید سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ بیان کرتے تھے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: جو شخص کسی نجومی کے پاس جائے کہ اُس سے کوئی سوال پوچھے، اُس کی چالیس شب و روز کی نمازیں قبول نہیں کی جاتیں۔

یعنی اِس گناہ کی سزا کے طور پر۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اوہام کی پیروی کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیسا سخت ہے۔

قصہ مختصر

نعیم احمد بلوچ

عالم بے بسی کا!

واقعات نے ایسی کروٹ لی کہ دنیا کو یہ فکر دامن گیر ہونے لگی کہ تیسری عالمی جنگ اب دہلیز پر کھڑی ہے۔ مگر پھر جنگ لڑنے والوں نے نوید دی کہ سب خیریت ہے۔ جنگ بندی کرادی گئی ہے۔ بے ترتیب دھڑکنوں کو قرار آگیا لیکن ذہنوں میں یہ خیال ضرور آیا کہ جنگوں کا فیصلہ کرنے والے تو زیر زمین محفوظ قلعوں میں جا براجمان ہوں گے مگر کروڑوں عوام کا کیا ہوگا؟

ایک محتاط اور مستند تحقیق کے مطابق دنیا کے نو ممالک کے پاس مجموعی طور پر تقریباً تیرہ ہزار سے زیادہ ایٹمی ہتھیار ہیں۔ اگر صرف چند بڑے شہروں پر بھی ایٹمی حملے ہوں تو لاکھوں افراد فوری طور پر ہلاک ہو سکتے ہیں، جبکہ تابکاری، بیماری، قحط اور ماحولیات کی تباہی سے کروڑوں سے اربوں افراد بعد میں متاثر ہو سکتے ہیں۔ اس قیامت خیز موسمی تبدیلی کو "نیوکلیئر ونٹر" کہتے ہیں۔ اس سے حیوانی یا نباتاتی، دونوں قسموں کی غذائیں تباہ ہو جائیں گی۔ یوں دنیا کی آٹھ ارب آبادی میں تین سے پانچ ارب افراد بھوک اور بیماریوں سے ختم ہو جائیں گے۔

فرض کریں یہ جنگ ایٹمی جنگ نہیں، بلکہ روایتی جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تب بھی کروڑوں افراد کا ہلاک اور بے گھر ہو جانا یقینی ہے۔ کیونکہ دوسری عالمی جنگ میں تقریباً سات کروڑ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ آبادی میں اضافے کے تناسب سے اب یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔

یہ تو صرف اسلحہ اور فوجی کارروائیوں کی تباہ کاری کا تخمینہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اقتصادی تباہی، عالمی نظام صحت کا انہدام، مہاجرین کا بحران، وبائی امراض اور سیاسی افراتفری بھی جنم لے سکتی ہے۔ یہ اثرات ایسے ملکوں کو بھی شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں جو جنگ کا براہ راست حصہ نہ ہوں۔ کیونکہ دنیا اب ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔

قصہ مختصر

اس تلخ تخمینے کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ جب بھی ہوئی وہ چند مہم جو اور طالع آزما لیڈروں کے غلط اور شدید قسم کے خود غرضانہ اور سطحی مقاصد کے حصول کی خاطر ہوگی۔ پچھلی جنگوں میں ہٹلر کی مثال بہت واضح ہے اور اس دور میں ہمیں دنیا کے سیاسی سٹیج پر ایک نہیں کئی "ہٹلر" نظر آرہے ہیں۔ پچھلی جنگوں میں اگر قومی اور نسلی تعصب نے ان لیڈروں کو اندھا کر رکھا تھا تو موجودہ صورت حال میں مذہبی تعصب کا خطرناک فیکٹر بھی شامل ہو چکا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم عوام جن کی جنگوں کو شروع کرنے میں کوئی رائے شامل نہیں ہوتی اور جن کے مفادات کو کبھی سامنے نہیں رکھا جاتا اور جو ان خطرات کا اصل ہدف بنتے ہیں، وہ کیا کریں؟

ہم عوام کو سب سے پہلے اپنے شعور کو بیدار اور بلند کرنا ہوگا۔ اس کی ضرورت کس قدر زیادہ ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت اسرائیل اور ایران دونوں میں فتح کے شادیانے بج رہے ہیں اور اس سے قبل پاکستان اور ہندستان کی چند روزہ جھڑپ میں بھی یہی صورت حال تھی کہ دونوں اپنے آپ کو فتح مند سمجھ رہے ہیں۔ اس کے نتیجے ہر طرف نفرت کی آندھیاں چل رہی ہیں اور جذبات کے خون آشام عفریت ایک دوسرے کو نگلنے کو تیار بیٹھے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال کبھی بھی حقیقت کے قریب نہیں ہوسکتی۔ لازمی طور پر ایک ملک شکست کھاتا ہے اور دوسرے نے دشمن کے ارادوں اور اس کے اہداف کو پورا نہیں ہونے دیا ہوتا۔ لیکن یہ لیڈر اپنے عوام کو بے وقوف بناتے ہیں۔ انھیں یقین دلاتے ہیں کہ مکمل فتح اور دشمن کو نیست نابود کرنے کے لیے مزید خون اور مزید نقصان کی بلی درکار ہے۔

ہم عوام کو ایک بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ جنگ میں ہمیشہ لیڈروں کی جیت یا ہار ہوتی ہے جبکہ عوام ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں ۔ جانیں ،املاک ، کاروبار انہی کے تباہ ہوتے ہیں ۔ کامیاب اور قابل لیڈر وہ ہوتے ہیں جو تنازعات کا سیاسی اور مذاکراتی حل نکالتے ہیں ۔ جنگ کی نوبت نہیں آنے دیتے۔ وہ مستقبل بینی کے ذریعے سے حالات کا درست اندازہ کرتے ہوئے اپنے عوام کو اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ناکام اور کوتاہ بیں ہیں۔ ہاں اگر کسی قوم کی شوریدہ سری اور جارحیت اس قدر بڑھ جائے کہ وہ اس کا شکار ہو جائے تو پھر دیکھنا ہوگا کہ اس کے اسباب کیا تھے؟

دوسرے یہ کہ عوام کو معلوم ہونا چاہیے ہمارے حکمران عالمی ضمیر کی آواز سے کس قدر ہم آہنگ ہیں؟ کیونکہ عالمی ضمیر کی آواز کو نظرانداز تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں موجود سچائی کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عوام کو اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اگر ان کے حکمران عالمی ضمیر کو پس پشت ڈالتے ہیں تو وہ بطور قوم دنیا میں اپنی ساکھ کو مجروح کر بیٹھیں گے۔ ان کے حکمران اگر دوسری قوموں سے وعدہ خلافی کے مرتکب ہوتے ہیں تو کل کو وہ اپنی قوم کو بھی اسی کہہ مکرنیوں سے دوچار کریں گے۔ اگر دوسری قوم کمزور ہے اور وہ اس کی وعدہ خلافی اور زیادتی کا شکار ہوئی ہے تو کل کو وہ اس قوم کے انتقام اور نفرت کا شکار ہوں گے۔ کوئی بھی قوم یا ملک ہمیشہ کے لیے عروج میں نہیں رہ سکتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسے بھی زمانے کی کروٹوں کا شکار ہونا ہوگا۔ اس لیے ایسی ظلم و زیادتی پر عوام کو اپنے حکمرانوں کا احتساب ضرور کرنا چاہیے۔ ان کو درست راہ کی طرف لانے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ قوم کی دانش کو اس شعور کا اظہار کرنا چاہیے کہ ناانصافی کی بنیاد پر کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ کمزوروں پر جب ظلم کی انتہا کی جاتی ہے تو وہ جائز اور ناجائز کی تمیز بھول جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنی بقا کے لیے ہر حد پار کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مظلوم قومیں اپنے جرائم کا اخلاقی جواز ڈھونڈ لیتی ہیں۔ یہ تاریخ کا وہ سبق ہے جسے بھولنے والے عوام ہوں یا حکمران، اس کو بھگت کر رہتے ہیں۔

دوسری اہم ترین بات ان عوام کے غور کرنے کی ہے جو اپنے حکمرانوں کے پراپوگنڈے کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے یہ جانتے ہیں وہ شکست اور ہزیمت سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان عوام کو اپنے اندر اس شعور کو بیدار کرنا چاہیے کہ عالمی قانون کو پامال کر کے انصاف کا حصول ناممکن ہے۔ انھیں ایسا اخلاقی کردار پیش کرنا ہوگا کہ ان کی آواز میں اثر پیدا ہو۔ ان کا مقدمہ عدل کی عدالت میں پیش کیا جاسکتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا تسلیم کرے کہ ان کا وجود انسانیت کی فلاح کے لیے ناگزیر ہے۔ دنیا کی ترقی میں ان کا کردار اس قدر اہم ہو کہ زمانہ ان سے محروم ہونے کو بہت بڑا نقصان سمجھے اور ان کے وجود سے محرومی انھیں کسی طور گوارا نہ ہو۔ اس کے برعکس محض نفرت، انتقام اور احساس برتری کا رویہ کسی کو قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا سب سے خطرناک مقام یہ ہے کسی قوم کا وجود دنیا کے امن اور اس کی ترقی میں رکاوٹ بن جائے۔

درخت کا پھل اس کے کانٹوں سے زیادہ ہے تو اسے زندہ رہنے کی اجازت ملتی ورنہ اسے تلف کر دیا جاتا ہے۔ یہی اس دنیا کی تلخ ترین حقیقت ہے!

نامور خواتین

جاوید احمد غامدی

ازواجِ مطہرات

اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کے حوالے سے عام ذہنوں میں یہ سوال اکثر زیر بحث رہتا ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے نکاح کے لیے زیادہ سے زیادہ چار خواتین سے نکاح کی اجازت ہے لیکن حضور نے گیارہ نکاح کیے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس مضمون میں اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے۔

انسان کی تخلیق جس فطرت پر ہوئی ہے، اُس کی رو سے خاندان کا ادارہ اپنی اصلی خوبیوں کے ساتھ ایک ہی مرد و عورت میں رشتۂ نکاح سے قائم ہوتا ہے۔ انسان کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زندگی میں یہی چیز ملحوظ رکھی اور ایک بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح کا خیال نہیں کیا۔ چنانچہ ۲۵ برس کی عمر میں آپ نے پہلی شادی سیدہ خدیجہ سے کی۔ یہ خاتون اگرچہ بچوں والی تھیں اور اِن کے دو شوہر اِس سے پہلے انتقال کر چکے تھے، لیکن اپنی پاکیزگی طینت کے باعث طاہرہ کی صفت سے موصوف تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شباب کا سارا زمانہ اِنھی کی رفاقت میں گزارا۔ یہ شادی کم و بیش ۲۵ برس تک قائم رہی، یہاں تک کہ اِن کا انتقال ہو گیا اور گھر بار کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے آپ تنہا رہ گئے۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ ایک صحابیہ خولہ بنت حکیم نے آپ کو توجہ دلائی کہ سیدہ خدیجہ کی رفاقت سے محرومی کے بعد آپ کی ضرورت ہے کہ آپ شادی کر لیں۔ اُس نے عرض کیا:

یا رسول اللّٰه، كأني أراك قد دخلتك خُلّةٌ لفقد خديجة ... أفلا أخطب عليك؟

(الطبقات الكبریٰ، ابن سعد ۸/ ۵۷)

”اللہ کے رسول، میں دیکھتی ہوں کہ خدیجہ کی رفاقت سے محرومی کے بعد آپ گویا محتاج سے ہو کر رہ گئے ہیں... میں آپ کی طرف سے کسی کو نکاح کا پیغام نہ دوں؟“

آپ نے پوچھا: کیا کوئی رشتہ ہے؟ اُس نے جواب دیا: آپ چاہیں تو کنواری بھی ہے اور شوہر دیدہ بھی۔ آپ نے پوچھا: کنواری کون ہے؟ اُس نے کہا: آپ کے عزیز ترین دوست کی بیٹی عائشہ۔ اور شوہر دیدہ؟ اُس نے کہا: سودہ بنت زمعہ جو آپ پر ایمان لا چکی ہیں اور آپ کے دین کی پیرو ہیں۔ آپ نے فرمایا: بات کر کے دیکھ لو۔ اُس نے بات کی تو دونوں جگہ منظور کر لی گئی۔ (مسند احمد، رقم ۲۵۲۴۱)

یہ بات چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کی گئی تھی، اِس لیے اب آپ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے نکاح تو دونوں سے کر لیا، لیکن رخصتی صرف سیدہ سودہ بنت زمعہ کی کرائی جو بیوہ اور عمر میں آپ کے برابر تھیں اور گھر در کی ذمہ داریوں کو بہتر طریقے پر پورا کر سکتی تھیں۔ چار سال تک یہی ایک خاتون آپ کے گھر میں رہیں، یہاں تک کہ سیدنا صدیق کے توجہ دلانے پر آپ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر میں لائے تو ساتھ ہی فیصلہ کر لیا کہ آپ سودہ بنت زمعہ کو طلاق دے دیں گے۔ اِس پر سودہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ وہ اُس عمر کو پہنچ چکی ہیں کہ زن و شو کے تعلق سے اب اُن کی کوئی دل چسپی باقی نہیں رہی، لہٰذا وہ اپنے حقوق عائشہ کے لیے چھوڑ دیں گی، مگر آپ اُنھیں طلاق نہ دیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ وہ قیامت کے دن آپ ہی کی ازواج میں اٹھائی جائیں۔ اِس پر آپ نے ارادہ ترک کر دیا، (الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۵۲/۸۔) لیکن اِس کے نتیجے میں عملاً ایک سیدہ عائشہ ہی آپ کی بیوی رہ گئیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت بشری میں یہی آپ کی ازواج ہیں۔ اِن کے علاوہ آپ نے اپنی اِس حیثیت میں کسی عورت کے ساتھ نکاح نہیں کیا۔ چنانچہ جو لوگ آپ کو تعدد ازواج کا الزام دیتے اور آپ کی پاکیزہ اور مطہر زندگی پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتے ہیں، اُن کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے سینے خدا کے خوف سے خالی ہیں۔ اِس لیے کہ جس ہستی کا حال یہ رہا ہو کہ ۲۵ سال کی ابتدائی زندگی میں کوئی شخص اُس کی سیرت و کردار پر حرف لانے کی جسارت نہ کر سکا؛ جس نے بھرپور جوانی میں شادی کی تو وہ بھی ایک ایسی خاتون سے جو بیوہ اور بچوں والی تھی؛ جس نے عرب کے معاشرے میں، جہاں تعدد ازواج کا عام رواج تھا، کم و بیش ۲۵ سال اِسی ایک خاتون کی رفاقت میں گزار دیے اور کبھی دوسری شادی کا سوچا تک نہیں؛ جس نے دوسرا نکاح کیا تو اُس کے انتقال کے بعد اور

وہ بھی ایک پچاس سال کی بیوہ خاتون سے اور جس نے پوری زندگی میں ایک ہی باکرہ خاتون سے شادی کی اور اُس کی رخصتی کو بھی کئی برس تک موخر کیے رکھا تاکہ بڑی عمر کی جس خاتون کو گھر در کی ذمہ داریوں کے لیے لے آیا گیا ہے، اُس کو عدم التفات کی شکایت نہ ہو، اُس کے بارے میں صرف ایک بیمار ذہن کا شخص ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ پچپن سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اُسے اچانک شادیوں کا ہوکا ہو گیا تھا اور اپنی خواہشِ نفس کی تسکین کے لیے اُس نے اپنے ہی بنائے ہوئے قانون میں ترمیم کی اور ایک کے بعد دوسری عورت سے نکاح کرنا شروع کر دیے تھے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ اپنی زندگی کے آخری آٹھ برسوں میں آپ نے مزید آٹھ خواتین سے نکاح کیا اور اِس کے لیے ایک خصوصی قانون بھی نازل کیا گیا، لیکن یہ نکاح نہ بشری حیثیت میں کیے گئے، نہ اپنی خواہش سے اور نہ خواہش نفس کی تسکین کے لیے، بلکہ خدا کے آخری پیغمبر کی حیثیت سے اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اور خدا کے حکم پر یا اُس کے ایما سے کیے گئے تھے۔ کوئی سلیم الطبع آدمی جس نے تعصبات کو الگ رکھ کر کبھی اِس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اِس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

۱۔ بدر اور احد کی جنگوں میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے جن کی بیواؤں اور یتیم بچوں کی نگہداشت مدینے کی چھوٹی سی ریاست میں ایک اجتماعی مسئلہ بن گئی۔ لہٰذا قرآن نے توجہ دلائی کہ اِن یتیم بچوں کے اعزہ اور سرپرست اگر یہ اندیشہ رکھتے ہوں کہ یتیموں کے اموال واملاک اور حقوق کی نگہداشت جیسی کچھ ہونی چاہیے، وہ کوئی آسان کام نہیں ہے اور وہ تنہا اِس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تو اُنھیں چاہیے کہ اُن کی ماؤں میں سے جو اُن کے لیے جائز ہوں، اُن کے ساتھ نکاح کر لیں۔ یہ بات اللہ پروردگار عالم کی طرف سے کہی گئی تھی جس پر سب سے بڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو لبیک کہنا چاہیے تھی۔ چنانچہ آپ نے کہی اور تین بیوہ خواتین سے شادی کر لی۔ یہ تین خواتین حفصہ بنت عمر، زینب بنت خزیمہ اور ام سلمہ بنت ابی امیہ تھیں۔

۲۔ قرآن نے غلامی کو ختم کرنے اور معاشرے میں غلاموں کا مرتبہ بڑھانے کے لیے ہدایات دیں تو اُن پر عمل کا نمونہ پیش کرنے کے لیے آپ نے اپنی پھوپھی زاد سیدہ زینب بنت جحش کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید رضی اللہ عنہ سے کرا دیا۔ یہ بڑا غیر معمولی اور دوررس نتائج کا حامل اقدام تھا، مگر بدقسمتی سے دونوں میں نباہ نہیں ہو سکا اور زید نے اُنھیں طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ سیدہ کے لیے یہ بڑے صدمے کی بات تھی۔ اِس لیے کہ پہلے ایک معاشرتی اصلاح کے لیے اُنھوں نے ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہا جانا قبول کیا اور پھر مطلقہ بھی ہو گئیں۔

چنانچہ اُن کی دل داری اور متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کی حرمت کے جاہلی تصور کو بالکل ختم کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ سیدہ سے خود نکاح کر لیں، دراں حالیکہ اُس وقت چار بیویاں پہلے سے آپ کے نکاح میں تھیں۔ اِس پر جو لوگ معترض ہو سکتے تھے، اُن کی تنبیہ کے لیے فرمایا کہ آپ خاتم النبیین ہیں، لہٰذا یہ اصلاح آپ ہی کو کرنی ہے، آپ کے بعد کوئی دوسرا اِس کے لیے آنے والا نہیں ہے۔ سیدہ اور اُن کے شوہر کے درمیان جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی، اُس میں آپ خود بھی محسوس کرتے تھے کہ یہی کرنا پڑے گا، لیکن اِسے ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کھول دی اور آپ کو توجہ دلائی کہ اللہ کے پیغمبر اپنی منصبی ذمہ داریوں کے معاملے میں لوگوں کے ردعمل کی پروا نہیں کرتے۔ لہٰذا سیدہ کے ساتھ آپ کے نکاح کا اعلان خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں کر دیا گیا۔ سورۂ احزاب میں ہے:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ: اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ، وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ، وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ. فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا، وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا. (۳۳: ۳۷)

”اور یاد کرو، (اے پیغمبر)، جب تم اُس شخص سے بار بار کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو اور اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنے والا تھا اور لوگوں سے ڈر رہے تھے، دراں حالیکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اُس سے ڈرو۔ چنانچہ جب زید نے اُس (خاتون) سے اپنا تعلق توڑ لیا تو ہم نے تمھیں اُس سے بیاہ دیا، اِس لیے کہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے، جب وہ اُن سے تعلق توڑ چکے ہوں۔ اور اللہ کا یہ حکم تو عمل میں آنا ہی تھا۔“

۳۔ یہ اعلان ہوا تو اِس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح و طلاق کا ایک مفصل ضابطہ بھی اللہ تعالیٰ نے اِسی سورہ میں بیان کر دیا جس میں تعدد ازواج کے وہ شرائط تو اٹھا دیے گئے جو عام مسلمانوں پر عائد کیے گئے ہیں، لیکن اِس کے ساتھ بعض ایسی پابندیاں آپ پر عائد کر دی گئیں جو عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہیں۔ یہ ضابطہ سورۂ احزاب (۳۳) کی آیات ۵۰۔ ۵۲ میں بیان ہوا ہے اور جن نکات پر مبنی ہے، وہ یہ ہیں:

اولاً، سیدہ زینب سے نکاح کے بعد بھی آپ اگر چاہیں تو درج ذیل تین مقاصد کے لیے مزید نکاح کر سکتے ہیں:

1۔ اُن خاندانی عورتوں کی عزت افزائی کے لیے جو آپ کے کسی جنگی اقدام کے نتیجے میں قیدی بن کر آپ کے قبضے میں آجائیں۔

2۔ اُن خواتین کی دل داری کے لیے جو محض حصول نسبت کی غرض سے آپ کے ساتھ نکاح کی خواہش مند ہوں اور آگے بڑھ کر اپنے آپ کو ہبہ کر دیں۔

3۔ اپنی اُن چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد کی تالیف قلب کے لیے جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور اِس طرح اپنا گھر بار اور اپنے اعزہ واقربا، سب کو چھوڑ کر آپ کا ساتھ دیا ہے۔

ثانیاً، یہ نکاح چونکہ ایک دینی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے کیے جائیں گے، اِس لیے اپنی اِن بیویوں کے ساتھ بالکل یکساں تعلق رکھنے کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی۔

ثالثاً، اِن خواتین کے سوا دوسری تمام عورتیں اب آپ کے لیے حرام ہیں۔ (چنانچہ اِسی پابندی کے باعث سیدہ ماریہ کے ساتھ آپ نکاح نہیں کر سکے اور وہ ملک یمین ہی کے طریقے پر آپ کے گھر میں رہیں۔) اور اِن سے ایک مرتبہ نکاح کر لینے کے بعد اِنھیں الگ کر کے اِن کی جگہ کوئی دوسری بیوی بھی آپ نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ آپ کو کتنی ہی پسند ہو۔

اِس کے صاف معنی یہ تھے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جن عورتوں کو آپ کی دعوت پر لبیک کہنے یا آپ کے کسی اقدام کے نتیجے میں شدید صدموں سے دوچار ہونا پڑا ہے یا اُن کے اندر آپ سے حصول نسبت کی شدید خواہش ہے، آپ اُن سے نکاح کریں۔ یہ اِن عورتوں پر پروردگار عالم کی کمال شفقت کا اظہار تھا۔ چنانچہ اِس ایما کو سمجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ جویریہ اور سیدہ صفیہ کے ساتھ پہلے مقصد کے لیے نکاح کیا۔ سیدہ میمونہ دوسرے مقصد سے آپ کی ازواج میں شامل ہوئیں اور سیدہ ام حبیبہ کے ساتھ آپ کا نکاح تیسرے مقصد کے پیش نظر ہوا۔

اِس سے واضح ہے کہ یہ ایک خالص دینی ذمہ داری تھی جو نبوت ورسالت کے منصبی تقاضوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہوئی اور آپ نے اِسے پورا کر دیا۔ بشری خواہشات سے اِس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ اِسے عام قانون سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ سورۂ احزاب کا جو ضابطہ اوپر مذکور ہے، وہ اِسی استثنا کو بیان کرتا ہے۔

محمد حسن الیاس

استاد کبھی نہیں ڈانٹتا

یہ تحریر اُس استاد کے لیے ہے، جس کی سختی میں محبت ہو اور لہجے میں اصلاح کی تڑپ۔ ایسا استاد جو ڈانٹتا نہیں، جگاتا ہے، جبر نہیں تربیت کرتا ہے۔ جس کی بلند آواز دراصل ہماری نیند کو توڑنے کی کوشش ہو، نہ کہ ہماری ذات کو کچلنے کا حربہ۔ تحقیر اور تشدد تعلیم نہیں، اور جو سکھانے کے نام پر خوف بانٹے، وہ استاد نہیں، اسے خود کسی استاد کی ضرورت ہے۔

استاد کبھی نہیں ڈانٹتا، وہ تو بس اپنی آواز کو ہمارے اندھیروں میں اتارتا ہے، تاکہ ہم ارادوں کی دھند اور معمولات کی دوڑ میں اپنے اصل وجود کی آواز سن سکیں۔

اس کی ڈانٹ، دراصل ہمارے اندر دبی ہوئی ان صداؤں کو جگانے کی کوشش ہوتی ہے، جنہیں ہم نے سہولت، خوف یا خود فراموشی کی تہوں تلے دفن کر رکھا ہوتا ہے۔

وہ ہمیں صرف جھنجھوڑتا نہیں، بلکہ ہمیں وہ آئینہ دکھاتا ہے جس سے ہم برسوں نظریں چرا چکے ہوتے ہیں۔

یاد دلاتا ہے کہ ہم محض ایک شخص، وجود، ایک نمرتا نہیں، بلکہ ایک ایسا امکان ہیں، جسے ابھی تک ہم نے خود دریافت نہیں کیا۔

جس لمحے وہ سختی کرتا ہے، وہ دراصل ہمارے وجود کے اس حصے کو تپش دیتا ہے، جہاں کچھ بننے کی سچّی تڑپ سلگتی تو ہے، مگر ہم نے اسے خود سے چھپا رکھا ہوتا ہے۔

اس کی ڈانٹ کا مقصد ہمیں گرانا نہیں ہوتا، بلکہ ہمیں اٹھانا ہوتا ہے۔ اس ملبے سے جو ہم نے خود پر اوڑھ لیا ہو۔

لہٰذا اس کی سرزنش پر دکھ ہمیں اپنی انا کے ٹوٹنے کا نہیں ہونا چاہیے، دکھ تو اس بات پر ہونا چاہیے کہ ہم نے اُسے اُس مقام تک لا کھڑا کیا، جہاں اُسے سختی کرنی پڑی۔

کیونکہ اصل اذیت استاد کی ہوتی ہے، وہ جو ہم سے زیادہ ہم پر یقین رکھتا ہے۔

وہ جو چاہے تو خاموش بھی ہو سکتا ہے، پیچھے ہٹ سکتا ہے، مگر وہ چپ نہیں رہتا۔۔۔

کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہمارا خواب اب بھی سانس لے رہا ہے... اور وہ سانس اگر ہمیں سنائی نہیں دیتی، تو وہ اپنی آواز بلند کرتا ہے، تاکہ ہم جاگ سکیں۔۔۔

استاد کی ڈانٹ کو "ڈانٹ" مت سمجھیں!

یہ وہ جھکاؤ ہے جو اس وقت جنم لیتا ہے، جب ایک آنکھ اپنے شاگرد کو اس مقام سے نیچے گرتا دیکھتی ہے، جہاں وہ اسے ہمیشہ دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ وہ اضطراب ہے، جو ایک دل میں اس وقت اٹھتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ہم اپنے آپ سے کم پر راضی ہو چکے ہیں۔

وہ ہمیں نہیں جھڑکتا، بلکہ اس خواب کو جگاتا ہے... جو ہم نے دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ استاد کی ڈانٹ، اگر دل سننے کو تیار ہو، تو محض آواز نہیں رہتی وہ ایک در کھولتی ہے۔

اپنے اندر جھانکنے کا در، وہ در جو ہمیں ہمارے التوا میں پڑے خواب، ماند پڑی قابلیت، اور اندر ہی اندر سسکتے امکانات سے آشنا کرتا ہے۔

اگر ہم اس ڈانٹ کو رد کرنے کے بجائے، اسے اپنے شعور کے دروازے پر ایک دستک سمجھیں، تو یہی سختی ہمیں ہمارے جامد دائرے عمل سے نکال کر افلاک کی نئی سمت میں لے جا سکتی ہے۔

لیکن یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب ہم استاد کے سامنے انا کے خول اتار کر، سیکھنے کی نیت سے، کھلے دل کے ساتھ حاضر ہوں۔۔۔

نہ کسی دفاع کے ساتھ، نہ کسی الجھن کے ساتھ، بلکہ صرف اس یقین کے ساتھ کہ کبھی کبھی حقیقت وہی ہوتی ہے جو ہمیں کڑوی لگتی ہے، مگر ہمیں بہتر بنانے آئی ہوتی ہے۔۔۔

یاد رکھیں، جس دن استاد خاموش ہو جائے، وہ دن حقیقت میں ڈرنے کا دن ہے۔

کیونکہ خاموشی وہاں اترتی ہے، جہاں توقع مر چکی ہوتی ہے۔

اور اگر استاد نے آج ہمیں ڈانٹا ہے تو شکر ادا کیجیے...
کہ کوئی ہے، جو اب بھی ہمارے عروج کا خواب دیکھتا ہے۔

رہبر بھی یہ ہمدم بھی یہ غم خوار ہمارے
استاد یہ قوموں کے ہیں معمار ہمارے

ناقابل فراموش

نعیم احمد بلوچ

مردانگی

یہ کہانی ایک وکیل کی سچی داستان سے ماخوذ ہے۔ اسے پہلی دفعہ مردانگی کے حقیقی مفہوم سے آشنائی ہوئی تھی۔ ایک ایسی حقیقت جس سے ان گنت مرد ناآشنا ہیں۔ ایک عورت کی ایسی داستان جسے ہر مرد کو بار بار پڑھنا چاہیے تاکہ وہ اس کے شعور کا حصہ بن سکے

عدالت کے احاطے میں موسم ہمیشہ ایک سا رہتا ہے۔ بے رحم، بے چہرہ، اور خاموش۔ اس دن بھی سورج پوری قوت سے چمک رہا تھا، لیکن عدالت کی دیواروں کے بیچ سایہ صرف انسانوں کے وجود کا نہیں، ان کے زخموں کا بھی تھا۔

ناقابل فراموش

میں کمرہ عدالت میں داخل ہوا تو وہ دونوں پہلے سے موجود تھے۔ مرد خاموش، سر جھکائے، کمرے کے فرش کو تجریدی آرٹ سمجھ کر اس سے کوئی مفہوم اخذ کرنا چاہ رہا تھا۔ شاید وہ ان زخموں کے سائے سے پریشان تھا جو اسے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس کے تحت الشعور میں موجود تھے۔ عورت بظاہر پرسکون، لیکن نگاہ میں ایک عجیب الجھاؤ تھا۔ ان گنت پہیلیوں اور بے اندازہ الجھنوں کا ٹھہراؤ۔ اُس کے دو ننھے بچے عدالتی کرسیوں پر بیٹھے معصوم نظروں سے اِدھر اُدھر جھانک رہے تھے۔ جج صاحب کے چہرے پر سوال تھا، اور فائل میں سے بس ایک لفظ:

"خلع"

جج صاحب یقیناً فائل کا مطالعہ کر چکے تھے۔ مقدمے کی حقیقت کو شاید سمجھ چکے تھے۔ انھوں نے دونوں کو غور سے دیکھا، پھر نرمی سے بولے:

"کیس کی نوعیت سنجیدہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ میاں بیوی چیمبر میں آ کر کچھ دیر گفتگو کریں۔ شاید بات بن جائے۔"

مجھے جیسے زندگی کی ڈوبتی نبض میں نئی سانس محسوس ہوئی۔ بحیثیت وکیل، میں نے مقدمہ تو لے لیا تھا لیکن اب تک کی جانکاری سے مجھے شدید خدشہ تھا کہ میں اس مقدمے میں ہار کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ چیمبر میں گفت وشنید کا موقع گویا وقت نے بخش دیا تھا۔

ہم تینوں چیمبر میں آ بیٹھے۔ مرد خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا، اس کے چہرے پر کوئی ان کہی تحریر لکھی تھی۔ عورت نے ساڑھی کے پلو کو سنبھالا اور باوقار انداز میں بیٹھ گئی۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں جو چہرے کے تاثرات کو پڑھنے میں باکمال سمجھا جاتا ہوں، اس چہرے پر کچھ نہ پڑھ سکا۔ عجیب اجنبی زبان لکھی تھی اس کے چہرے پر!

میں نے سوال کیا:

"بی بی، وجہ بتائیں۔ یہ خلع کیوں؟"

اُس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا:

"یہ شخص مرد ہی نہیں ہے۔"

لفظ کمرے کی دیواروں سے ٹکرایا اور مجھے لگا جیسے کوئی کانچ کا گلدان فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا ہو۔ میرے اندر کا وکیل لمحہ بھر کے لیے رک گیا، مگر میں نے خود کو سنبھالا:

"مگر آپ کے دو بچے ہیں۔ پھر یہ الزام کیسے؟"

ناقابل فراموش

"مجھے اصرار ہے اپنے لفظوں پر۔۔۔اس کے باپ بننے کے بعد ہی مجھے یقین ہوا کہ اس میں مردانگی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

میں نے تیکھا لہجہ اپنایا:

"کمزوری کی وضاحت کریں گی محترمہ؟"

اُس نے گہری سانس لی، پلکیں جھپکائیں، پھر گویا وقت کی گرد جھاڑ کر بولی:

"صرف بچے پیدا کرنا ہی مردانگی نہیں ہوتی وکیل صاحب۔"

میں اس کی بے باکی پر حیران رہ گیا۔اب میرے اندر کے وکیل پر ایک مرد کا قبضہ ہو چکا تھا۔میرے منہ سے ایک گندی سی گالی نکلتے نکلتے رہ گئی۔البتہ منہ میں تو دے ہی ڈالی اور میرے احساس نے اسے سنا بھی۔ویسے تو کچہری میں زیادہ تر بے باک خواتین سے ہی واسطہ پڑتا ہے لیکن اس خاتون کی کچھ بات ہی الگ تھی۔

اس کے شوہر نے ایک نظرِ شکایت اس پر ڈالی اور میری طرف امداد طلب نظروں سے گویا منت سماجت کرنے لگا۔ میں تھوڑا سا جھلا گیا کہ کیسی عورت ہے ذرا بھی شرم حیا نہیں ہے۔دو بچوں کی ماں ہو کر بھی اپنے شوہر کو نامرد کہہ رہی ہے۔

بہر حال میں نے بھی شرم وحیا کا تقاضا ایک طرف رکھا اور "پورا وکیل" بن کر تیز تیز سوال کرنا شروع کر دیے۔

"کیا تمہارا اپنے شوہر سے گزارہ نہیں ہوتا؟

"ماشاءاللہ دو بچے ہیں ہمارے۔یہ جسمانی طور پہ تو بالکل ٹھیک ہیں مگر پھر بھی یہ نامرد ہیں۔"

مجھے اس کی بات سے حیرت کا جھٹکا لگا کہ بچے بھی ہیں اور نامرد بھی، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔عجیب عورت ہے۔

"تو بی بی پھر مردانہ طور پر کمزور کیسے ہوئے؟" میں نے زچ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب! صرف ازدواجی زندگی سے اولاد ہو جائے یہ ہی مردانگی نہیں ہوتی بلکہ اور بھی ایسی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں میاں بیوی کے درمیان جس پر بیوی مرد سے مطمئن نہیں ہو پاتی اور مرد نامرد ہی قرار پاتا ہے۔"

مجھے اس عورت کی منطق کسی بھی طرح سمجھ نہیں آئی تھی۔۔ میرے اندر کا مرد شدید الجھن کا شکار تھا کہ بھئی فقط "مطمئن" نہ ہونے پر کس طرح سے اپنے مرد کی عزت یوں کوٹ کچہری میں اچھال رہی ہے۔یہ معاملہ تو ان دونوں کے مابین بھی حل ہو سکتا تھا۔۔

میں نے نظر اٹھا کر اس کے شوہر کو دیکھا۔۔مجھے صاف لگا کہ اس کے چہرے پر اپنا سچ کھل جانے کا شدید خوف لاحق تھا۔۔

"آپ کو اگر خدا نے اولاد سے نواز رکھا ہے بی بی اور اگر یہ جسمانی طور پر بھی ٹھیک ہیں تو اگر آپ کو ان سب کے باوجود کسی مسئلے اور بے چینی کا سامنا ہے تو آپ ڈاکٹر سے رابطہ کر سکتی تھیں۔یوں کوٹ کچہری آنا تو اس معاملے کا حل نہ تھا۔"

"ان کی کمزوری کسی بھی ڈاکٹر سے دور نہیں ہو سکتی تھی وکیل صاحب۔۔۔تبھی مجھے یہ راہ چننی پڑی۔۔"

عجب عورت تھی اک تو انتہا کی بے باکی اوپر سے کمال کا اعتماد۔۔۔اور وجہ ایسی کہ کوئی اور ہوتا تو شرم سے ڈوب کر مر جاتا۔جانے یہ کیسی عورت تھی۔۔اس کا حلیہ اس کی باتوں سے ذرا نہ ملتا تھا مگر ہر کسی کے ماتھے پر تھوڑا ہی لکھا ہوتا ہے کہ وہ اندر سے کیسا ہے۔میرے اندر کا مرد اس عورت پر طرح طرح کے جملے کس رہا تھا۔مگر اپنے وکیل ہونے کا بھرم بھی رکھنا تھا،بولا:

"بی بی ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔"

میں نے ذرا توقف کیا۔مجھے اب اس عورت پر غصہ آنے لگا تھا اور اس کے شوہر پر ترس۔۔

"میں آپ کو ایک اچھے ڈاکٹر کا پتہ دیتا ہوں آپ وہاں جائیں۔سب بہتر ہو گا۔جہالت اور ضد میں آ کر گھر نہ توڑیں۔۔"

میں نے اپنے غصے پر بمشکل قابو پایا اور ایک جاننے والے قابل ڈاکٹر کا ایڈریس دینے کا سوچا جو مردانہ کمزوری کا ماہر مانا جاتا تھا۔میں اپنی طرف سے ہر کوشش کر کے اس جاہل عورت کو اس اقدام سے روکنا چاہتا تھا۔۔

"نہیں وکیل صاحب مجھے یقین ہے۔۔۔ان کا مرض لاعلاج ہے۔میں اس دور میں ایسے مرد کے ساتھ ایک منٹ نہیں رہوں گی۔"وہ بضد رہی۔مجھے بھی اب ضد ہو گئی تھی کہ ذرا اس کی اصلیت سب کے سامنے لاؤں۔بولا:

"جب آپ کی اولاد ہے تو پھر یہ بیماری اتنی بھی بڑی نہیں ہو گی۔لگتا ہے آپ سب کچھ اپنے شوہر کو بدنام کرنے کی وجہ سے کر رہی ہیں۔"اب کی بار میرا ضبط جواب دینے لگا تھا۔

"بیماری ہے وکیل صاحب۔۔۔۔بیماری ہے۔۔"اب کی بار وہ خاصے تلخ اور اونچی آواز میں چلائی تھی۔۔

"اگر ہے تو وضاحت کر دیں پھر۔۔"

میں بھی مصر تھا کہ وہ لفظاً اپنی بے شرمی اور بے باکی کا اظہار کرے۔ مگر جب وہ بولی تو میں حیرت اور خجالت کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔

"صرف بچے پیدا کرنا ہی مردانگی نہیں ہوتی وکیل صاحب! میرے بابا استاد تھے۔ ایک اسکول میں۔۔۔ دیہات میں رہتے تھے مرحوم اور پورا گاؤں کہتا کہ ان جیسا بارعب اور خوب صورت مرد کبھی نہیں دیکھا۔ ماشاءاللہ بڑے قد کاٹھ کے، بااخلاق اور انتہائی مدد کرنے والے انسان تھے، ہمیشہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ہم تین بہنیں ہیں اور میرے والد نے ہمیں ہمیشہ "بیٹا" کہہ کر بلایا۔ ہمیں اپنی شہزادیاں کہتے۔۔۔ جبکہ میرے شوہر مجھے "خبیث عورت" کہہ کر بلاتے ہیں۔۔۔ حقیر اور ناپاک جانوروں کی مادائیں کہہ کر بلاتے۔۔۔ میں یہاں ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں کر سکتی۔۔۔ یہ کون سی مردانہ صفت ہے وکیل صاحب؟ اب بتائیں مرد میرے باپ جیسا شخص ہوا یا یہ "خبیث اور حقیر جانور" کہنے والا؟"

ماحول میں یک دم ایک گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ لگتا تھا جیسے کوئی بم پھٹ گیا ہو۔۔۔ جان دار کوئی نہ بچا ہو اور اب خاموشی ہو گئی ہو۔ اس کی آواز پھر بلند ہوئی:

"مجھ سے کوئی چھوٹی موٹی غلطی ہو جائے تو یہ میرے پورے میکے کو غلیظ گالیاں دیتے ہیں۔ ان کے مختلف جانوروں سے تعلق بیان کرتے ہیں۔۔۔ اپنے ناجائز تعلق کی خواہش کا دانت پیس پیس کر منہ بگاڑ بگاڑ کر اظہار کرتے ہیں۔ آپ ہی بتائیں جی کہ اس میں میرے ماں باپ کا کیا قصور؟۔۔ شاید یہی کہ انھوں نے انھیں اپنا عزیز جان کر میرا ہاتھ انھیں تھمایا۔۔۔ مگر انھوں نے انھیں مرد جانا تھا۔۔۔ مگر یہ کیا یہ مردانگی دکھائی انھوں نے؟"

جب کسی کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا تو وہ پھر بولی: "وکیل صاحب۔! میرے بابا مجھے شہزادی کہتے ہیں اور یہ غصے میں مجھے "پیشہ ور عورت" اور یہ خطاب اپنی بیوی کو دیتے ہیں۔۔ کیا بطور شوہر یہ ان کی مردانگی کے مطابق ہے؟"

وکیل صاحب! مرد تو وہ ہوتا ہے نا جو پیشہ ور عورت کو بھی اتنی عزت دے کہ وہ پیشہ کرنا چھوڑ دے اور یہ اپنی ہی بیوی اور پھر اس کی ماں کو ہی پیشہ ور کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور یہ لفظ تو میں بول رہی ہوں۔ ان سے پوچھیں ان کی مردانگی انھیں اس لفظ کی بجائے کون سا لفظ بولنے پر مجبور کرتی ہے؟؟؟ وکیل صاحب اب آپ ہی بتائیں نا۔۔۔ کیا ان کا یہ طرز تخاطب مردانگی پر پورا اترتا ہے یا انتہائی درجے کی کمزوری پر؟ اور یہ تو صرف بدزبانی ہے۔۔۔ اس کے علاوہ یہ بات بے بات پر جو بے عزتی اور ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں، میری شخصیت میری روح کو لہولہان کرتے ہیں۔۔۔ اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔۔۔ کیا اس کمزوری کا علاج کوئی ڈاکٹر کر سکتا ہے؟"

میرا تو سر شرم سے جھک گیا تھا۔اس کا شوہر بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میری اس سوچ کو وہ عورت واقعی سچ ثابت کر گئی تھی کہ ضروری نہیں جیسا باطن ہو ویسا ہی ظاہر بھی ہو۔۔۔

"میرے شوہر کے نزدیک مردانگی کا ثبوت گالی گلوچ،بدتمیزی اور بداطواری ہے۔"

میں گنگ بیٹھا تھا۔لفظ 'نامرد' اب جسمانی نہیں،اخلاقی مفہوم اختیار کر چکا تھا۔بطور مرد میں اس پہلو پر غور ہی نہ کر سکا کہ مرادنگی کا ایک ہی روپ نہیں ہوتا۔ جسمانی بے مردمی کا علاج ممکن ہے لیکن روح کی بے مردمی واقعی لاعلاج ہے۔ میں نے شوہر کی طرف دیکھا۔ چہرے پر شدید کرب،آنکھوں میں وحشت اور زبان پر قفل۔ مجھے کسی عارف کی بات یاد آگئی۔ بدزبان بہت بزدل ہوتا ہے ورنہ وہ بدزبانی کا سہارا نہ لے۔ لیکن میں وکیل تھا،ابھی نہیں ہارا تھا۔بولا:

"بی بی،آپ نے کبھی کوشش نہیں کی اسے سمجھانے کی؟"

"کوشش؟جب ان گنت دفعہ ناکام ہوئی تو میں نے خود کو اس کے غصے کے نیچے دفن کر دیا۔ سوچا،وقت بدل جائے گا۔ مگر جب اس نے میری بیٹی کے سامنے بدزبانی کی تو میری بیٹی نے مجھے ان گالیوں کا مطلب پوچھا جو یہ مجھے دے رہا تھا۔بس یہی وہ لمحہ تھا جب برداشت اور انتظار دونوں ختم ہو گئے۔ میرے اندر کی عورت جو مر گئی وہ ماں بن کر جاگ اٹھی۔"

اچانک اُس کا شوہر بول اٹھا۔اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"اگر یہی بات تھی تو پہلے بتا دیتی۔ مجھے اس طرح سب کے سامنے رسوا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ ہنسی، مگر اس ہنسی میں دکھ کی ہچکی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ کی زبان نے میرے وجود کو روز رسوا کیا، میری روح تک کو زخمایا اور آپ کو ایک ساعت کی رسوائی ناقابل برداشت ہو گئی؟"

وہ ایک عورت بول رہی تھی، مگر اس کی آواز میں ہمارے سماج کی کئی عورتوں کی صدائیں تھیں۔

خاتون نے چند لمحے توقف کیا، بچوں کی طرف دیکھا، اور پھر اُس مرد کی طرف، جس نے اس کی عزت کو بار بار روندا تھا۔ شاید اُسے امید کی ایک دھندلی لکیر نظر آئی۔

"وکیل صاحب، اگر میں آپ کی بیٹی ہوتی تو آپ میرے شوہر کا مقدمہ لڑتے؟

ناقابل فراموش

میرے تخیل نے میری پندرہ برس کی بیٹی کو دلہن بنادیا۔ پھر مجھے وہ روتی ہوئی نظر آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ موجودہ قانون کے مطابق خلع کا مطلب طلاق بائن ہوتا ہے۔ اسی لیے عام طور جج حضرات خلع کے حق میں فیصلہ دینے سے ہچکچاتے ہیں۔ مگر آج مجھے پہلی دفعہ اس قانون میں سقم نظر آیا۔ یہ عجیب تھا کہ مرد طلاق دے تو اسے طلاقِ بائن اور طلاق رجعی دونوں کا حق ہے لیکن عورت خلع لے تو اسے یہ حق حاصل نہیں۔ اس کا خلع طلاق بائن کیوں سمجھا جائے؟ وہ ایک طلاق کیوں نہ تصور کیا جائے؟ کیا خلع کی جرات کرنا اصل میں مرد کی "مردانگی" کے خلاف ہے؟ مجھے پہلی دفعہ شریعت میں بھی "بے انصافی" نظر آئی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ خدا کی شریعت کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ خدا ظالم نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ نہ مرد ہے نہ عورت۔ وہ دونوں کے تعصبات سے پاک ہے۔ مگر یہ قانون تو مردانگی کا بے ہنگم شاہکار ہے۔ اسی لیے مرد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عورت پر اپنا دروازہ بند کر دیتا ہے! سچی بات ہے کہ میں اور میری ساری مردانگی آج خود انصاف کے کٹہرے میں کھڑی تھی۔ اور میری زبان کو تالا لگ گیا۔

مجھے گنگ دیکھ کر وہ بے باک عورت جج سے مخاطب ہوئی: "سر! مجھے وہ فیصلہ سنائیے گا، جو اس جیسی صورت حال میں آپ کی بیٹی کو بھی قابلِ قبول ہو۔۔"

یہ بات عام حالات میں واضح طور پر کسی جج کے پروٹوکول کے خلاف تھی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں عجیب غیض وغضب دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور یہ اشارہ تھا کہ ہمیں اب ان کے اگلے حکم کا انتظار کرنا ہوگا۔

میں جب چیمبر سے نکل رہا تھا تو سوچ رہا کہ گالیاں تو میں نے بھی اس خاتون کو اس کے پہلے بیان پر دل ہی دل میں بہت دی تھیں۔۔۔ شاید میں بھی نامرد ہوں اور شاید ہمارا معاشرہ نامردوں سے بھرا پڑا ہے۔ عورت اپنے ارمانوں کا سہرا مرد کے سر پر باندھ کر اور اس کی مردانگی سے توقع رکھتی ہے وہ اس کا مان نہیں توڑے گا۔ میں یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ مجھے لگا کہ شاید جیسے ہم سب نامرد ہیں کیونکہ مردانگی کا مطلب صرف طاقت نہیں، بچے پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ تہذیب، برداشت اور شائستگی بھی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ اس کیس کا جج صاحب کیا فیصلہ دیں گے۔ یقیناً خلع۔۔۔ ہمیشہ کی علیحدگی۔

مگر میرے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ فیصلہ عجیب تھا:

"ملزم پر دعویٰ ثابت ہو چکا ہے۔ وہ بیمار ہے۔ بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کے ناقابل۔ اس کا گھر اس کے صحت یاب ہونے تک اس کی بیوی بچوں کے پاس رہے گا۔ اس بات کا فیصلہ اس کی بیوی ہی کرے گا کہ اس کی مردانگی واپس آچکی ہے یا نہیں!"

خود احتسابی

محمد حسن الیاس

دروازہ جو اندر کھلتا ہے

دل و دماغ پر دستک دیتے یہ بیس سوالات ایک آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس آئینے میں ہم اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔اور پھر اس تصویر میں آنے والے نقص خود ہی دور کر سکتے ہیں۔

سوچیے کہ زندگی میں آپ کسی کام میں مسلسل محنت کر رہے ہوں اور کسی معتبر ذریعے سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے تو کیا آپ وہ سچ جاننے کا موقع ضائع کریں گے ؟

اگر وہ خبر امید افزا ہو، تو دل کو قرار آ جائے، محنت میں اعتماد پیدا ہو، اور انسان مزید ثابت قدمی سے اسی راستے پر چلتا رہے۔

اور اگر وہ خبر مایوس کن ہو، لیکن وقت ابھی باقی ہو، تو شاید یہی وہ موقع ہو جب انسان اپنی تدبیر، اپنی حکمتِ عملی پر نظرِ ثانی کرے، اور بہتر نتائج کے لیے راستہ تبدیل کر لے۔

یہ کوئی خیالی بات نہیں۔

جو اصول ہم دنیا کے کسی کام میں برتتے ہیں, وہی اصول ہماری پوری زندگی پر بھی صادق آتا ہے۔یہی وہ حقیقت ہے جو ایک مومن کی زندگی پر ہمہ وقت سایہ فگن ہے۔۔۔

ہم سب ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جو نہ وقت کا پابند ہے، نہ حالات کا محتاج۔یہ آزمائش ہر لمحے، ہر قدم، اور ہر رویے میں جاری رہتی ہے۔اگرچہ اس کا حتمی نتیجہ قیامت کے دن ظاہر ہو گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا ہی میں ایسے عملی پیمانے عطا کر دیے ہیں جن کی مدد سے ہم اپنے انجام کی جھلک دیکھ سکتے ہیں، اور یہ جان سکتے ہیں کہ ہم

خود احتسابی

اس امتحان میں کس مقام پر کھڑے ہیں۔

تو آیئے، کچھ دیر کے لیے رکیں۔ دنیا کی ہنگامہ خیزی سے الگ ہو کر، دل کی عدالت میں خود کو پیش کریں۔ کسی فتوے یا ظاہری رائے کے بجائے، اپنے وجدان، اپنے ضمیر، اور اپنے باطن سے یہ سوالات پوچھیں۔ شاید ان میں چھپی سچائی ہمیں وہ جھلک دکھادے جو کل ہمارے انجام کی مکمل تصویر بننے والی ہے:

☆ کیا میں ان لوگوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتا ہوں جنہیں دل قبول نہیں کرتا؟ کیا میرا اسلام اخلاص سے ہوتا ہے، یا بس تعلق نبھانے کی مجبوری بن چکا ہے؟

☆ کیا میں اپنے ماتحتوں یا کمزور طبقات کے ساتھ عزت، شفقت اور حلم سے پیش آتا ہوں؟ یا میرے رویے میں نخوت، تحکم اور تلخی جھلکتی ہے؟

☆ کیا غصے کی حالت میں میری زبان میرے قابو میں رہتی ہے؟ یا میرے الفاظ صرف تلخ ہی نہیں، دلوں کو چیر دینے والے ہوتے ہیں؟ جب کوئی دل دُکھائے، تو کیا میں صبر کرتا ہوں، یا کسی محفل میں اُس کی عزت کو خاک میں ملانے کی راہ ڈھونڈتا ہوں؟

☆ کیا میں کسی کی غیر موجودگی کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع بنالیتا ہوں؟ اور پھر اس کی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے، افواہ کو الزام، اور الزام کو بہتان بنادیتا ہوں؟

☆ کیا میرا علم، میری زبان، اور میرا اندازِ گفتگو دوسروں پر اپنی برتری جتانے کا ذریعہ ہے؟ یا واقعی ایک خیر خواہانہ پیغام؟

☆ کیا کسی مخالف کی لغزش میرے دل کو سکون دیتی ہے، جیسے اندر چھپی انا کو ایک خاموش فتح مل گئی ہو؟
اور کیا میں اُس لمحے کو اصلاح کا نہیں، انتقام کا موقع سمجھتا ہوں؟

☆ کیا میرا ظاہر وہی ہے جو میرا باطن ہے؟ کیا میری تنہائی اور میری محفل، میرے قول اور میرا عمل، ایک ہی سچ بولتے ہیں؟ یا میں ہر ماحول کے مطابق چہرہ بدلنے کا ہنر جانتا ہوں؟

☆ کیا میں کبھی کسی دنیوی منفعت کے لیے اپنے ضمیر کو خاموش کرادیتا ہوں حتیٰ کہ اُس لمحے بھی، جب میرے سامنے عدل روند دیا جاتا ہے؟ کیا میں بااثر لوگوں کی قربت حاصل کرنے کے شوق میں اپنی عزتِ نفس کا سودا کر بیٹھتا ہوں؟ کیا میں اپنی زبان، رائے یا خودداری کو محض ان کی خوشنودی کے لیے گروی رکھ دیتا ہوں؟

خود احتسابی

☆ کیا میرے والدین میرے سلوک میں وہ محبت محسوس کرتے ہیں جو اُن کا حق ہے؟ یا میں محض خدمت کے پردے میں ایک خاموش بیگانگی چھپا رہا ہوں؟

☆ کیا دوسروں کی ترقی پر میں دل سے خوش ہوتا ہوں؟ یا میرے دل میں چھپا ہوا حسد چاہتا ہے کہ یہ عزت ان سے چھن جائے؟

کیا میں سچ بولنے کی ہمت رکھتا ہوں جب وہ میری عزت کو خطرے میں ڈال دے؟ یا لوگوں کے ڈر سے کسی پرانے جھوٹ کا اقرار نہ کروں

☆ کیا میری نیکی واقعی خدا کے لیے ہوتی ہے؟ یا میں چاہتا ہوں کہ لوگ اسے دیکھیں، سراہیں، اور مجھے نیک کہیں؟

☆ کیا میری بے وقت تنقید، میری اونچی آواز، یا میرا طنز کسی ایسے دل پر بوجھ ڈال دیتا ہے جو صرف خاموش رہ کر سب کچھ سہہ لیتا ہے؟

☆ کیا میری نماز رب سے ملاقات ہے، یا محض سر جھکانے کی مشق؟ کیا میرا روزہ نفس کی اصلاح ہے، یا صرف بھوکا رہنے کا معمول؟ کیا میری زکوٰۃ کسی ضرورت مند کی امید بنتی ہے، یا بس سالانہ حساب کا ایک مرحلہ؟

☆ کیا میں اختلاف کے لمحے میں دلیل سے بات کرتا ہوں، یا مخاطب کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر اُس کی عزتِ نفس کو روند دیتا ہوں؟

☆ کیا میں غلطی پر خود کو پیش کر کے اقرار کرتا ہوں، یا کسی اور کو قصوروار بنا کر خود کو معصوم ظاہر کرتا ہوں؟

☆ کیا میں تنہائی میں بھی وہی کچھ کرتا ہوں جو میں چاہتا ہوں کہ دنیا کے سامنے ہو؟ یا میرا اصل چہرہ صرف اندھیرے میں ظاہر ہوتا ہے؟ کیا میں دوسروں کو نصیحت کرتے ہوئے کبھی خود کو اس ترازو میں تولتا ہوں جس پر دوسروں کو پرکھتا ہوں؟

شاید یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جہاں انسان کو خود سے سوال نہیں، سچ مانگنا چاہیے۔ جب سوالات صرف الفاظ نہیں رہتے وہ آئینہ بن جاتے ہیں، اور آئینے کے سامنے آدمی صرف دوسروں کی نہیں، اپنی اصل صورت بھی دیکھ لیتا ہے۔ وہ صورت، جو دنیا سے چھپی نہیں، لیکن خود سے چھپائی گئی ہوتی ہے۔ ہم اکثر دنیا کے اسٹیج پر اپنی کامیابی، مقام اور تاثر کو ہی اصل کامیابی سمجھ بیٹھتے ہیں۔

ظاہری فتوحات ہماری تسلی بن جاتی ہیں، اور ہم وہ سوالات بھول جاتے ہیں جو ہمارے حقیقی انجام سے جُڑے ہوتے ہیں۔

خود احتسابی

ہم دوسروں کو دکھانے کے لیے اپنی صورت سنوارتے ہیں، لیکن اپنے اندر جھانکنے سے کتراتے ہیں۔
اس سے پہلے کہ وقت کا دروازہ بند ہو جائے، ہم سب خود سے وہ سچی بات ضرور کہہ ڈالیں جو برسوں سے دل کے در پر دستک دے رہی ہے، مگر ہم نے ہر بار نظرانداز کر دی۔
کیونکہ انجام کی گھڑی خاموشی سے آتی ہے، مگر اُس کی بازگشت کبھی خاموش نہیں ہوتی۔

کلثوم ثاقب

ایمان بالغیب کیا ہے؟

ایک اہم موضوع پر غور و فکر پر ابھارتے اہم سوالات۔ان کے ذریعے سے ہم اپنے ایمان کی کیفیت بھی جان سکتے ہیں اور یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں اس میں کہاں کہاں خرابیاں اور کج فہمیاں ہیں!

ایمان ـــــ یعنی یقین، اعتبار ـــــ آخر کس چیز کا نام ہے؟ میرے نزدیک یقین کی بلند ترین منزل کا نام ہے: یُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ۔ یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، بغیر دیکھے یقین کرتے ہیں۔

اب آپ کہیں گے کہ یہ تو ہم سب مسلمان کرتے ہیں۔ ہم ایمان لاتے ہیں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر۔ اور یہ تو ہمیں سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات سے ازبر ہے:

الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔۔۔۔

بظاہر یہ سب کچھ سیدھی سادی باتیں لگتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے:

کیا واقعی ہم ایمان بالغیب رکھتے ہیں؟

اگر رکھتے ہیں تو معرفت کی منزلیں طے کرنے کی تڑپ کیوں ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟

روح کیا چیز ہے؟

جنت و دوزخ کی وہ تفصیلات جن کا ذکر اللہ نے نہیں کیا، اور وہ تشبیہات جن کا مقصد محض تسلی دینا ہے ـــــ ان

بحثوں میں کون الجھا ہوا ہے؟

صوفی ازم کا شوق کس کو بے قرار کر رہا ہے؟ اور اس شوق سے در حقیقت حاصل کیا کرنا مقصود ہے؟

کیا یہ سب کچھ کر کے ہم واقعی "متقین" میں شامل ہو سکتے ہیں؟

کیونکہ متقین کی تعریف تو یہ کی گئی ہے کہ وہ غیب کے پردے کو چاک کرنے کی جستجو نہیں کرتے، بلکہ بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں۔

یہ ایمان بالغیب محض آزمائش نہیں، بلکہ اللہ کی رحمت ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی فزکس کا پروفیسر ۲۰۰۰ صفحات کی کتاب میں سے ۲۰۰ صفحات منتخب کر کے کہہ دے کہ انہی کو پڑھ لو، کامیاب ہو جاؤ گے — تو کیا ہم ان باقی صفحات میں الجھنے لگیں گے جن کا ہم سے سوال ہی نہیں کیا جائے گا؟

یقین یا ایمان ایک عجیب و لطیف شے ہے۔

چھوٹے بچوں کو کامل یقین ہوتا ہے کہ ان کی ماں اسکول کے باہر بیٹھی رہتی ہے اور چھٹی کے بعد ضرور لے جائے گی۔ یہی یقین ان کے خوف کو زائل کرتا ہے۔ لیکن جس دن یہ یقین ٹوٹتا ہے، وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے، ایک بار میں نے اپنی چھوٹی بہن کی سائیکل کو دھکا دیا اور تھک کر بغیر بتائے چھوڑ دیا۔ میرا گمان تھا کہ وہ گرے گی، رک جائے گی، لیکن وہ چلتی رہی — کیونکہ اسے یقین تھا کہ میں نے اسے تھاما ہوا ہے۔ جب پلٹ کر دیکھا اور مجھے نہ پایا تو گر پڑی۔ یقین ٹوٹ گیا تھا۔

ہم اپنی اولاد کو کہتے ہیں: اللہ ہر وقت تمہارے ساتھ ہے، تمہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ مان بھی لیتے ہیں۔ لیکن ان کا یقین اُس وقت ٹوٹتا ہے جب وہ ہمیں جھوٹ بولتے، رشوت لیتے، یا کسی کا حق مارتے دیکھتے ہیں۔

ایک حکایت ہے:

ایک ماں روز کہتی، "دستر خوان لگا لو، اللہ کھانا دیتا ہے۔" ایک دن ماں گھر پر نہ تھی۔ بچہ اسکول سے آیا، وضو کیا، دستر خوان بچھایا اور اللہ پر یقین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب ماں پہنچی تو دیکھا کہ بچہ کھانا کھا رہا ہے۔

اب سوال یہ نہیں کہ کھانا کیسے پہنچا — اللہ مُسَبِّبُ الاَسباب ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک بچہ اس یقین پر بیٹھ سکتا ہے تو آپ کس ڈر سے رشوت لیتے ہیں؟

کیا آپ کو یقین نہیں کہ عزت، روزی اور آزمائش سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں؟

کیا آپ اللہ پر بھروسا کر کے دیکھ چکے ہیں؟

جس معرفت کی تلاش میں ہم در در پھرتے ہیں، وہ معرفت تو خود آ جائے گی اگر اللہ پر بھروسا ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جب مدد آئے تو وسیلے کو معبود نہ بنایا جائے، اور یہ نہ کہا جائے کہ "یہ مدد کیوں اور کیسے آئی؟"

اللہ تعالیٰ نے تو واضح کر دیا ہے کہ غیب کا پردہ قیامت کے دن ہٹے گا۔

آج ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ایمان بالغیب کو مضبوطی سے تھام کر وہ عمل کریں جس کے لیے ہمیں دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

یہ ہمارا کام نہیں کہ جانیں قیامت کب آئے گی؟

یا شیطان پہلے کون سے مرتبے پر تھا؟

یا جنت کی علامتی تشبیہات کا تجزیہ کریں۔

یا یہ سوال کریں کہ "اسے زیادہ دولت والوں میں کیوں پیدا کیا؟ مجھے غریب گھر میں کیوں؟"

یہ سب غیب کے پردے ہیں، جن کا ہماری آزمائش یا انجام سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں الجھنا محض وقت کا ضیاع ہے۔

صراطِ مستقیم کوئی پہیلی نہیں اور نہ کوئی خفیہ راز، نہ متقی ہونے کے لیے چِلّے کاٹنے پڑتے ہیں۔

بس وہی کرنا ہے جو ہمارے اختیار میں ہے، نہ کہ ان باتوں میں الجھنا جو ہمارے دائرے سے باہر ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات میں ایک واقعہ ہے:

فرماتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں ایک بار جنّات اور عملیات کا شوق پیدا ہوا۔ استاد سے سوال کیا تو فرمایا: "ہاں، جن ہوتے ہیں، عملیات بھی ہوتے ہیں۔ سیکھ بھی سکتے ہو، میں سکھا بھی سکتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے: کس پر حکم چلانا چاہتے ہو؟ حاکمیت تو اللہ کا حق ہے۔ تمہارا کام بندگی ہے۔"

مولانا لکھتے ہیں کہ اسی وقت دل میں نفرت سی پیدا ہو گئی اس چیز سے جو مجھے بندگی کے مقام سے ہٹا دے۔

میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے بندہ بن کر رہنا ہے۔ مجھے ان شوقوں سے پرہیز کرنا ہے جو مجھے اللہ کی بندگی سے غافل کر دیں

جب اللہ فرماتا ہے کہ متقی وہ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور انفاق کرتے ہیں، تو ہمیں تسلی نہیں ہوتی۔

ہم کہتے ہیں، ''کچھ اور بھی تو ہونا چاہیے۔" ہم غیب کی باتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

قرآنی بصیرت

جب ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: "قیامت کب آئے گی؟"

آپ نے فرمایا: "تمہاری قیامت تو تمہاری موت ہے۔"

لیکن ہمیں یہ جواب کافی نہیں لگتا۔ ہم قیامت کی نشانیاں اکٹھی کرنا چاہتے ہیں، گویا ہمیں اس دن کا انتظام کرنا ہے!

قرآن کہتا ہے کہ اللہ صحابہ کرامؓ سے راضی ہو گیا۔ لیکن ہم کہتے ہیں: "تاریخ کی کتابیں تو کچھ اور بتاتی ہیں۔۔۔"

تو پوچھا جائے: "کیا اللہ پر یقین ہے؟ رسول ﷺ پر ایمان ہے؟ قرآن کو حرفِ آخر مانتے ہیں؟"

اگر نہیں، تو محض زبانی دعویٰ سے مسلمان ہونا کافی نہیں۔ اور پھر ہم جنت کے نہ صرف دعوے دار بلکہ ٹھیکے دار بنے پھرتے ہیں!

قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کہتے تھے: "دوزخ کی آگ ہمیں صرف چند دن چھوئے گی۔"

اللہ ان سے پوچھتا ہے: "کیا تم سے کوئی وعدہ لیا ہے اللہ نے جس کی خلاف ورزی نہ کرے؟"

مسلمانوں! ذرا غور کرو — تم بھی انہی باتوں پر تو بضد نہیں ہو؟ تمہیں کیا یقین ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ مختلف سلوک کرے گا؟

ایمان بالغیب، یقین، اور تسلیم — یہی اللہ سے تعلق کو زندہ رکھتے ہیں۔

بحث، اعتراض، تاویلات اور "اگر، مگر" ہمیں للہ سے دور کر دیتے ہیں۔ شیطان کی کوشش یہی ہے کہ تمہیں ان بحثوں میں لگا دے جہاں نہ دین ہے، نہ دنیا۔ تو بندے بنو۔ اپنی اصل کو پہچانو۔ اپنی جگہ پر جمے رہو۔ اسی میں تمہاری دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

بینش رمان کھرل

ہماری صحت ہماری ذمہ داری

ہماری صحت ہماری ذمے داری ہے۔ خواتین اس شعبے کو نظرانداز کر کے بہت سے مسائل کا شکار ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں ایسی قیمتی معلومات ہیں جن سے آپ کی زندگی کے بہت سے مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔

دور حاضر میں عورتوں کی خود مختاری پر بہت گفتگو ہوتی ہے۔ اور ''میرا جسم میری مرضی'' اور "می ٹو" جیسی تحریکوں، بہتر تعلیم اور شعور نے عورتوں کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے اچھے سے آگاہ کیا ہے۔ لیکن خواتین کی با اختیاری ایک بہت وسیع موضوع ہے۔ بااختیاری کی یہ مسلسل تحریک اپنے اندر بہت سے موضوعات کو لپیٹے ہوئے ہے۔

جہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ خواتین کو اپنے ساتھ ثقافتی اور معاشرتی ماحول میں یکساں سلوک ہونے کا شعور ہو، چاہے تعلیم کا معاملہ ہو یا سیاست کا یا کوئی اور دیگر مسئلہ، وہاں عورتوں کی صحت اور تندرستی کے مسائل پر بات کرنا اور نوجوان لڑکیوں میں بہتر صحت کے بارے میں آگہی کو اجاگر کرنا بھی انتہائی ضروری ہے۔

عورت کی صحت کے مسائل اس کی بالغ عمر میں پہنچتے ہی شروع ہو جاتے ہیں، جن کو ہمارے معاشرے میں پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اس پر بات کرنا اہم نہیں سمجھا جاتا اور یہی رجحان جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ لڑکی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتی ہے، وہ صحت کے ان مسائل سے غافل رہتی جو اس وقت گزرنے کے ساتھ پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور شاید اس ہی لیے ہمارے معاشرے میں عورتوں کی صحت کے مسائل بڑھتے ہی رہے ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شروع سے لڑکیوں کو یہ آگاہی نہیں ملتی کہ وہ اپنی موجودہ صحت یا آنے والے جسمانی مسائل کے بارے میں بات کریں۔

ایک لڑکی اپنی زندگی میں بہت سے مراحل سے گزرتی ہے۔ بالغ عمر میں پہنچنے سے لے کر ماں بننے کے عمل تک اور پھر بچوں کی پیدائش کے بعد کے مسائل سے لے کر مینوپوز تک کا سفر، عورت کی جسمانی اور ذہنی صحت پر دور رس نتائج رکھتا ہے۔ عورت کو زندگی کے مختلف مراحل میں صحت کے مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر لڑکیوں کو اس بارے میں بروقت آگاہ کیا جائے اور اسکول کالجز میں اس کے بارے میں تعلیم دی جائے تو بہت سے مسائل سے بچا جا سکتا ہے۔

یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ ایک نشست میں مکمل نہیں ہو سکتا، لیکن کہیں سے تو شروعات کرنی ہے! اس لیے میں نے عورت کی زندگی کا ایک خاص مرحلہ جو کہ ۴۰ سال کی عمر کے بعد شروع ہوتا ہے، اس کے بارے میں بات کرنے کا انتخاب کیا ہے۔ میں یہاں ہر عمر کے طبقے کی خواتین سے مخاطب ہوں۔

چالیسواں برس: نئی تبدیلیوں کا آغاز

اس عمر تک ہم عورتیں عام طور پر حمل اور بچوں کی پیدائش جیسے مراحل سے گزر چکی ہوتی ہیں۔ اُس وقت ہم کو

جسمانی طور پر جن تبدیلیوں سے گزرنا پڑتا ہے ہم آج ان کے بارے میں بات کریں گے۔ کیا مسائل لاحق ہو سکتے ہیں؟ان مسائل پر کسی طرح قابو پایا جاسکتا ہے؟یہی ہمارے اس آرٹیکل کا موضوع ہے۔

چالیس کی دہائی کے شروع ہوتے ہی خواتین زندگی کے ایسے مرحلے میں داخل ہوتی ہیں جہاں اجازت ہو تو یہ کہوں کہ جیسے جسمانی طور پر کوئی بغاوت یا ہڑتال شروع ہو گئی ہو! جسم میں ہمارے ہارمونز کی مقدار میں ایسی تبدیلیاں آتی ہیں جو ہمیں " پرِی مینوپاز "کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے اور قدرت نے اس کو ایسے ہی تخلیق کیا ہے۔ مگر اس تبدیلی کے باعث جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، وہ عورت کے لیئے تکلیف کا باعث بن سکتے ہیں۔ ان کے بارے میں معلومات رکھنا اور ان کو کسی طرح بہتر بنایا جائے، اس بارے میں علم ہونا ہر لڑکی کے لیے ضروری ہے۔

ان مسائل میں بے شمار تبدیلیاں شامل ہیں جیسے بے قائدہ ماہواری، نیند میں تبدیلی: جیسے نیند کا نہ آنا، مزاج میں چڑچڑاپن، روزمرہ کے کاموں کے لیے طاقت کا کم ہو جانا، جسم میں یا سر میں درد کا ہونا اور بعض اوقات بہت زیادہ گرمی یا سردی کا لگنا شامل ہے۔ یہ سب عورت کے اندر ہارمون کے لیولز میں تبدیلی سے ہوتا ہے۔ ان علامات کے بارے میں آگاہی ہونا اور ان کو بہترین طریقوں سے مینیج کرنا ہی اس وقت میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

اس عمر کی بیماریاں

ان علامات کے علاوہ عورت کا جسم کچھ بیماریوں کا سامنا کر سکتا ہے جس کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے۔

عورت کے جسم میں چالیس کی عمر کے بعد، ہارمون ایسٹروجن کی کمی کے باعث میٹابولک تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے شوگر اور دل کی بیماری کا خدشہ بڑھ سکتا ہے۔ آپ کی ہڈیوں کی مضبوطی بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے یعنی آپ کی ہڈیاں اتنی مضبوط نہیں رہتی جتنی کہ دس برس پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس وجہ سے جوڑوں کے درد اور "آسٹیوپوروسز" کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔

آپ کے جسم میں فیٹ اور مَسَل کی تقسیم بھی اس دہائی میں بُری طرح متاثر ہوتی ہیں یعنی آپ کا جسم فیٹ زیادہ جمع کرتا ہے اور مسل کم پیدا کرتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مسل کمزور ہوتے جاتے ہیں اور فیٹ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

مسائل کا حل

آپ کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ آپ اپنے اگلے ۱۰ سے ۲۰ برس کیسے گزاریں گی؟ ان سب مسائل سے

دور رہنے کے لیے کیا سیکھنا ہے؟ کیونکہ ہم اپنے جسم میں پیدا ہونے والی ان تبدیلیوں کو آنے سے روک نہیں سکتے مگر ان کے ساتھ بہتر زندگی گزارنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں! تاکہ ہمیں آگے بڑھتے ہوئے وقت میں کم سے کم صحت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے۔ آیئے اب ہم ان مسائل کے حل کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

غذا یا نیوٹریشن

آپ کو اپنے کھانے کے حوالے سے کچھ تبدیلیاں لانی پڑیں گی۔ اپنی خوراک کو متوازن بنانے کی بہت ضرورت ہے۔ اس دہائی میں اپنی خوراک میں سبزیوں کا استعمال زیادہ رکھنا چاہیے۔ یہ صرف کہنے کی بات نہیں ہے، اس کے پیچھے ایک پوری حکمت ہے۔ سبزی غذائیت میں زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ فائبر کا ذخیرہ بھی رکھتی ہے۔ جو کہ نہ صرف آپ کے نظامِ ہضم کے لیے بہت ضروری ہے بلکہ فائبر آپ کی گلوکوز کی مقدار کو بھی توازن میں رکھتا ہے۔ لہٰذا اپنی خوراک میں سلاد، کچی سبزیاں یا پکی ہوئی سبزیوں کو زیادہ شامل رکھیں۔ سبزیوں کے ساتھ ساتھ پھلوں کی مقدار کو توازن میں رکھنا ضروری ہے۔ یاد رہے! بہت زیادہ مقدار میں پھلوں کا استعمال آپ کی بلڈ شوگر کو بڑھا سکتا ہے۔ مگر پھر بھی پھل صحت کے لیے مفید ہیں مگر دن میں ایک کپ سے زیادہ نہیں۔ اب اگر آم کا موسم آگیا ہے تو مہربانی سے آموں پر ہاتھ ہولا رکھیں۔

پروٹین کی اہمیت پر میں ایک ہفتے تک بول سکتی ہوں! پروٹین کو اپنی غذا میں شامل کریں۔ روز ۸۰ سے ۱۰۰ گرام کی مقدار مناسب ہے۔ مچھلی اور مرغی کا استعمال مفید ہے۔ گوشت میں مٹن اور بیف کی مقدار میں احتیاط ضروری ہے۔ مگر مکمل پروٹین کا آپ کی غذا میں شامل ہونا عمر کے اس حصے کی ناگزیر ضرورت ہے۔

اناج یا عام زبان میں کاربز کی مقدار کو کم رکھنا چاہیے کیونکہ اس کی زیادہ مقدار آپ کی بلڈ شوگر کو بڑھا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ گلوکوز کو کم رکھنا ہے، پروٹین اور فائیبر کو زیادہ رکھنا، یہ اس دہائی کا اصول بنالیں۔

ورزش

افسوس اس بات کا ہے کہ جس ماحول میں میں بڑی ہوئی، اس میں ورزش کی اہمیت کا کہیں ذکر ہی نہیں ہوتا تھا۔ شکر ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے اور لوگوں میں ورزش کی اہمیت کا شعور بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی بھی ہمارا شعور وہاں نہیں پہنچا جہاں دنیا کی صحت مند قومیں ہیں۔ ورزش تو بچپن سے ہی کسی نہ کسی طرح کرنی چاہیئے۔ لیکن ایک عورت کی چالیسویں سالگرہ کے بعد ورزش بہت سے مسائل کا حل ہے! بین الاقوامی معیار کے مطابق ایک ہفتے میں، ۱۵۰ منٹ کی ہلکی پھلکی ورزش انتہائی ضروری ہے۔ یا یوں کہو کہ ناگزیر ہے! اس میں چلنا شامل ہے جو آپ ہر روز ۳۰ سے ۴۰ منٹ کر سکتی ہیں اور اگر آپ اس سے زیادہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں تو ۷۵ منٹ کی ہِٹ ٹریننگ کرنے کی کوشش کریں۔ جس میں سائی کلنگ، تیراکی یا ہائیکنگ شامل ہے۔ آپ اپنی عمر اور صلاحیت کے مطابق ورزش کا انتخاب کر سکتی ہیں۔ یوگا اور ایروبکس بھی اچھے انتخابات ہیں۔

اس کے علاوہ خواتین کے لیے وزن اٹھانے کی ٹریننگ کی اہمیت اس عمر میں بہت بڑھ جاتی ہے۔آپ کسی پیشہ ور ٹرینر کے ساتھ ہلکے وزن لے کر محتاط طریقے سے اس ٹریننگ کا آغاز کریں۔ ریسرچ سے ثابت ہوتا ہے کہ چالیس سال کی عمر کے بعد وزن کے ساتھ ٹریننگ آپ کی ہڈیوں کی طاقت بڑھانے اور مستقبل میں آسٹیوپوروسز اور فریکچرز سے بچنے کے لیے ناگزیر ہے۔ لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ اگر وہ وزن اٹھانے کی ورزش کریں گی تو ان کے بازو مردوں کی طرح بہت موٹے ہو جائیں گے۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے ! ایسا کچھ نہیں ہوتا! وزن اٹھانے سے ہماری طاقت میں اضافہ ہو گا اور ہمارے بازو بہت اچھے ٹون ہو جائیں گے۔

ذہنی صحت اور نیند

اب ہم ایک انتہائی اہم رکن کے بارے میں بات کریں گے ۔ وہ ہے ذہنی صحت اور نیند ! جونہی ایک لڑکی کی چالیسویں سالگرہ ختم ہوتی ہے، وہاں وہ دیگر مسائل سے دوچار ہو جاتی ہیں۔ ان ناختم ہونے والے مسائل میں انگزائٹی اور اِنسومنیا بھی شامل ہیں۔ ان دونوں مسئلوں کی وجہ سے ڈپریشن جیسے امراض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہارمون میں تبدیلی کی وجہ سے طبیعت میں ناراضی، بے یقینی اور جھنجھلاہٹ کا پایا جانا ایک عام عمل ہے۔ بہت سی خواتین کو نیند نہ آنے کی بھی شکایت رہتی ہے۔ ان مسائل پر قابو پانے کے لیے آپ کا اپنے لیے وقت نکالنا بہت ضروری ہے۔ اپنی ذات کو وقت دیں اور اپنے آپ کے لیے کوئی ایسا مشغلہ اختیار کریں جس سے آپ کو خوشی ملتی ہو۔ ورزش باقاعدگی سے کرنے اور کھلی ہوا میں وقت گزارنے سے نیند نہ آنے جیسے مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

غرض اپنے آپ کو وقت دینا اور ایک مشغلے کا انتخاب کرنا جو آپ کو ذہنی طور پر مصروف رکھے، نہایت اہم ہے۔ اور آخر میں ان تمام چیزوں کے علاوہ اپنا طبّی معائنہ باقاعدگی سے کرانا بہت ضروری ہے۔ اس میں بلڈ شوگر اور کولیسٹرول کے علاوہ خون کا مکمل جائزہ کروائیں۔ پاپ سمئیر (papsmear) اور میموگرام (mamogram) کا ٹیسٹ ہر دو سے پانچ سال کے اندر کرانا مت بھولیں۔ (عمر کے لحاظ سے دورانِ وقفہ ڈاکٹر سے ضرور معلوم کریں)

بروقت جانچ، مستقبل میں ہونے والی بہت سی بیماریوں پر قابو پانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وزن کو کم رکھنا بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس وقت آپ کو کیلشیم اور ڈی تھری جیسے وٹامنز اور اومیگا آئل کا استعمال کرنا چاہیے۔ وٹامن بی اور آئیرن بھی عورتوں کے لیے نہایت اہم ہیں۔

صحت و تندرستی

غرض یہ کہ صحت ایک توازن رکھنے کا نام ہے جس میں خوراک، ورزش، غذائیت، وٹامن اور منرَلز، ذہنی صحت اور سکون، سب مل کر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اپنے بارے میں جانیے اور اپنی صحت کا بیڑا خود اٹھائیے۔ ہماری ذہنی اور جسمانی صحت صرف ہماری ذمہ داری ہے۔
اپنی زندگی کے مسائل کا اثر اپنی صحت پر مت پڑنے دیں اور اپنے لائف اسٹائل کو بہتر بنائیں۔

ثوبیہ نورین

بیٹوں کی تربیت اور چند سنگین مسائل

اس مضمون میں ایسے اہم مگر بہت عام رویوں پر توجہ دلائی گئی ہے جو غیر شعوری طور پر ہماری اولاد پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو مضمون نگار کے نقطہ نظر سے کلی یا جزوی اختلاف ہو۔ ایسی صورت میں "صالحات" کے یہ صفحات آپ کے لیے حاضر ہیں۔ ہم آپ کا نقطہ نظر ضرور شائع کریں گے۔

ثناء یوسف کا قتل ہو یا نور مقدم کے ساتھ پیش آنے والی بھیانک واردات، اجتماعی بے حرمتی کے قصے ہوں یا بیٹی، بہن اور بیوی کا غیرت کے نام پر قتل — یہ سب وہ ناسور ہیں جنہیں کچھ لوگ آج کے نام نہاد روشن خیال دور میں بھی مسئلہ ماننے کو تیار نہیں۔ علاج تو دور کی بات ہے، انہیں سنجیدگی سے سمجھنے اور ان کی جڑ تک پہنچنے کی زحمت بھی کوئی گوارا نہیں کرتا۔

ہم اکثر بیٹیوں کی تربیت، ان کے تحفظ، حدود، کردار اور ذمہ داریوں پر گفتگو کرتے ہیں، مگر بیٹوں کی تربیت پر بات بہت کم ہوتی ہے۔ ہم اپنے بیٹوں کو کیسے پالتے ہیں؟ کیا سکھاتے ہیں؟ ان سے کیا توقعات وابستہ کرتے ہیں؟ ان کی شخصیت اور کردار میں گھر اور سماج کا کیا کردار ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر عمومی طور پر خاموشی چھائی رہتی ہے۔

یہاں میں ایک اہم نکتہ اٹھانا چاہتی ہوں — ایک فلم جس نے خاص طور پر لڑکوں کی تربیت کے مسائل، مردانگی اور عورت دشمنی جیسے حساس پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یاد رکھیے! ہماری بیٹیوں کو عزت و مقام دینا، ان کی حفاظت کو یقینی بنانا صرف نعرے بازی، جلوس نکالنے یا خواتین کے دن منانے سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے والدین اور ہر تربیتی ادارے کو سنجیدہ توجہ دینا ہو گی۔

میں آپ کی توجہ چند بنیادی نکات کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہوں جو اگر سمجھ لیے جائیں تو بیٹیوں کا مستقبل زیادہ محفوظ اور بیٹوں کی زندگی میں سکون اور خوشی کی ضمانت بن سکتے ہیں۔

ہمارے گھروں میں بچپن سے ہی کچھ جملے تربیت کے نام پر بچوں کو سنائے جاتے ہیں، جن کے پیچھے چھپی زہرناک نفسیات کو سمجھنا از حد ضروری ہے۔ یہ جملے لاشعوری طور پر لڑکوں کی ذہن سازی کر کے سماج میں آنے والی نسلوں کی تباہی کی بنیاد رکھتے ہیں۔

لڑکے روتے نہیں — "جذباتی گھٹن کا آغاز"

بچپن سے ہی بیٹوں کو سکھایا جاتا ہے کہ آنسو کمزوری کی علامت ہیں۔ "لڑکے روتے نہیں" جیسا جملہ بچوں کے ذہن میں یہ پیغام بٹھا دیتا ہے کہ دکھ، غم یا خوف کا اظہار شرم کی بات ہے۔ جذبات کو دبانا، ان سے انکار کرنا اور ہر حال میں مضبوط دکھائی دینا ہی مردانگی ہے۔

یہ بظاہر معمولی تربیت بعد ازاں اندرونی گھٹن میں بدل جاتی ہے۔ بچے اپنی بات کہنا چھوڑ دیتے ہیں، اپنے احساسات کو دباتے دباتے چڑچڑاہٹ، غصہ، بے حسی اور بعض اوقات پر تشدد رویوں تک جا پہنچتے ہیں۔ اس گھٹن کو اور بھی کئی جملے غذا دیتے ہیں جیسے:

- مرد کا بچہ ہے تو مقابلہ کر
- شیر دا پتر اے
- مرد ہے تو ڈٹ کر کھڑا ہو

یہ جملے نہ صرف معصوم بچوں کی شرافت اور معصومیت چھین لیتے ہیں بلکہ مرد کی بنیادی انسانیت کا بھی گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ یہی بچے بڑے ہو کر ازدواجی زندگی میں نرمی اور برداشت سے محروم رہتے ہیں۔ ان کے پاس دلیل کی جگہ اکڑ ہوتی ہے اور گفتگو کو کمزوری سمجھا جاتا ہے۔

غصہ مرد کی شان ہے — "عدم برداشت کی جڑ"

بچپن سے غصے کو طاقت کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ نرم دلی کو شرمناک قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہی سوچ آج ہمیں ہر طبقے اور ہر گھرانے میں گھریلو تشدد کی شکل میں نظر آتی ہے۔

مرد سخت جان ہوتا ہے—— "طاقت کے مظاہرے کا جنون"

یہ کہنا درست ہے کہ اللہ نے عورت کے مقابلے میں مرد کو عمومی طور پر جسمانی طاقت زیادہ دی ہے، مگر مسلسل اسی پہلو کو ابھارنے کے نتیجے میں ہمارے نوجوان اپنی مردانگی ثابت کرنے کے لیے بدن کو مصنوعی طاقت سے بھرنے میں لگے رہتے ہیں۔ لمبے لمبے وقت ورزش گاہوں میں گزرتے ہیں۔ طاقت کی نمائش کے لیے ہتھیار، دولت اور غنڈہ گردی کے رجحانات کو فروغ ملتا ہے۔

گلی محلوں اور تعلیمی اداروں میں لڑائی جھگڑے معمول بن جاتے ہیں۔ شریف لڑکوں کو بزدلی کے طعنے ملتے ہیں، ان کی غیرت کو للکارا جاتا ہے۔ اس سب کی جڑ ہمارے ہی بولے ہوئے جملے ہیں۔ ان کے نتائج کی ذمہ داری آخر کون لے گا؟

مرد بنو!—— "کردار کی قربانی"

ایسے جملے:

- گھر میں داخل ہوں تو سب چپ ہو جائیں
- مرد کا موڈ دیکھ کر بات کرو
- شوہر تو غصے کے تیز ہوتے ہیں، جواب نہ دیا کرو
- اچھی لڑکیاں بحث نہیں کرتیں

یہ سب لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی ذہنی تربیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مرد کو ندامت اور اعترافِ غلطی سے دور رکھا جاتا ہے جبکہ لڑکی کو چپ رہنے اور سب سہنے کی عادت ڈال دی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ مرد اپنی غلطیوں پر معافی مانگنے کو اپنی توہین سمجھتا ہے اور سیکھنے کا عمل رک جاتا ہے۔

لڑکیوں کی طرح مت بنو—— "نفرت کا زہر"

کمزوری، ہچکچاہٹ یا شرم کو لڑکیوں سے جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے:

- ذرا کمزور پڑے تو کہا جاتا ہے: "لڑکیوں کی طرح نہ بن"
- شرمایا تو طعنہ: "یہ لڑکیوں کی طرح شرما رہا ہے"

- کوئی نرمی دکھائے تو طعنہ: "چوڑیاں پہن لی ہیں کیا؟"

یہ جملے عورت کو کمتر، قابل نفرت اور طعنہ دینے کی علامت بنا دیتے ہیں۔ مرد اپنے اندر سے ہر وہ وصف نکال پھینکتے ہیں جو کسی بھی طرح عورت سے جڑتا ہو۔

بہنوں کا محافظ —— "غیرت کا غلط تصور"

جب ایک دس سالہ بچے کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی بہن کا محافظ ہے تو ہم بھول جاتے ہیں کہ ایک بچے کے ذہن پر کیسا بوجھ ڈال رہے ہیں۔ اس بظاہر معصوم جملے کا نتیجہ یہ نکلیا ہے کہ بیٹا بہن کا محافظ بنتے بنتے اس کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ یہی سوچ بعد میں غیرت کے نام پر پابندیوں، تشدد اور بعض اوقات جان لینے تک جا پہنچتی ہے۔

ابھی بہت سے جملے اور رویے باقی ہیں جن کی نشاندہی اگلی تحریر میں کی جائے گی۔ لیکن تب تک آپ خود سوچیے کہ کیا واقعی بیٹوں کی تربیت کو ہم طاقت، غصے اور سرد مہری کا نام دے کر اپنی نئی نسل کو انسانیت سے محروم نہیں کر رہے؟ کیا ہم جذباتی اظہار، ہمدردی اور گفت وشنید کو نسوانی اوصاف کہہ کر بیٹوں کو ان سے دور نہیں کر رہے؟ کیا بیٹوں کی تربیت صرف مرد تیار کرنے کا نام ہے یا باکردار، ہمدرد اور انصاف پسند انسان بنانے کا؟

وقت آ گیا ہے کہ ہم سب خود کو بدلیں، آگاہی حاصل کریں اور اپنی اولاد کی بہتر تربیت کے لیے خود پر بھی محنت کریں۔

نورین شیخ

کیا بتائیں اور کیا نہ بتائیں؟

سماجی تعلقات میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ ہم اپنے محبت کے تعلقات میں کس چیز کو لوگوں کے ساتھ شیئر کریں اور کس کو نہ کریں۔ اس موضوع پر یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ اس سے ہم بہت سی قباحتوں سے نجات پا سکتے ہیں۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے بہت سے راستے دوسروں کے ساتھ طے کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ دوسرے ہمارے رشتہ دار ہوتے ہیں، دوست احباب ہوتے ہیں یا ہمارے قریب کے لوگ۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ہم سفر بنیں، ہماری باتیں سنیں، ہماری محفلوں کا حصہ بنیں، ہمارے خیالات اور منصوبوں میں شریک ہوں۔ اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ انسان سماجی وجود ہے، تنہائی اس کے بس کی بات نہیں۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ ہر راستہ، ہر بات، ہر منصوبہ سب کے مطلب کی چیز نہیں۔ کچھ باتیں ہمارے دل کے قریب ہوتی ہیں، مگر دوسرے کی دلچسپی ان میں نہیں ہوتی۔ کچھ محفلیں ہمیں سازگار لگتی ہیں، مگر دوسرے وہاں خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ یوں آہستہ آہستہ ہمیں احساس ہونے لگتا ہے کہ ہر بات سب کو بتانا بھی ضروری نہیں، اور ہر راستے پر سب کو ساتھ لے چلنا بھی ممکن نہیں۔

پھر ہم خود سے عہد کرتے ہیں کہ اب کچھ باتیں اپنے تک محدود رکھیں گے۔ کوئی کتاب پڑھنی شروع کی ہے، کوئی محفل جوائن کی ہے، کوئی نیا حلقہ احباب بنا ہے، تو اسے ضروری نہیں کہ سب کو بتایا جائے۔ لیکن یہی نقطہ ہمیں ایک نئے احساس میں مبتلا کر دیتا ہے — خوف کا احساس، گناہ کا احساس۔ دل کہتا ہے کہ اگر انہیں خبر ہو گئی تو وہ کہیں گے کہ چھپا لیا۔

نقطہ نظر

حالانکہ چھپانے اور نہ بتانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کچھ باتیں محض اس لیے نہیں بتائی جاتیں کہ ان کی ضرورت نہیں۔ بھلا کیا فائدہ کہ میں کسی کو بتاؤں کہ میں نے کھانا کھا کر فون کیا یا فون کے بعد کھانا کھاؤں گی؟ یہ چھپانا نہیں، بس غیر ضروری اطلاع نہ دینا ہے۔ اسی طرح اگر فون بند ہو جائے اور کوئی مہمان آجائے تو یہ لازم نہیں کہ ہر آنے جانے والے کی خبر دوستوں کو دی جائے۔

اصل مسئلہ تب بنتا ہے جب رشتوں میں بے جا پابندی آجائے۔ جب محبت میں یہ خوف سرایت کر جائے کہ اگر نہ بتایا تو شکایت ہو گی، گلہ ہو گا، تعلق کمزور پڑ جائے گا۔ حالانکہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں آزادی کی گنجائش ہو۔ ہمیں بھی سانس لینے کی جگہ ملے، دوسرے کو بھی۔ اگر محبت کا رشتہ آزادی نہ دے تو وہ بوجھ بن جاتا ہے۔

ہمیں خود بھی یہ بات سمجھنی ہے اور اپنے قریبی لوگوں کو بھی یہ سمجھانی ہے کہ کچھ باتوں کا نہ بتانا تعلق کی کمزوری نہیں، بلکہ اس کی صحت کی علامت ہے۔ محبت کو اتنا تنگ نہ کریں کہ اس کا دم گھٹ جائے۔ دوستی ہو، خاندان ہو یا رشتہ داریاں—سب اسی اصول پر پروان چڑھتی ہیں۔

زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ تعلقات میں اعتماد ہو، مگر اس اعتماد کی بنیاد بے جا خوف اور غیر ضروری تفصیل پر نہ ہو۔ محبتیں جب کشادگی دیتی ہیں تو پنپتی ہیں، ورنہ گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں۔

اس لیے محبت کو محبت ہی رہنے دیں، گرفت نہ بنائیں۔ رشتے کو ڈھیل دیں، اتنی کہ وہ مضبوطی سے بندھا رہے، اور اتنی کہ وہ سانس بھی لے سکے۔ یہی راز ہے پائیدار محبت اور سچے رشتے کا۔

مبارک صدیقی

کمال یہ ہے

خزاں کی رُت میں گلاب لہجہ بنا کے رکھنا کمال یہ ہے
ہوا کی زد پہ دیا جلانا، جلا کے رکھنا، کمال یہ ہے

ذرا سی لغزش پہ توڑ دیتے ہیں سب تعلق زمانے والے
سو ایسے ویسوں سے بھی تعلق بنا کے رکھنا، کمال یہ ہے

کسی کو دینا یہ مشورہ کہ وہ دکھ بچھڑنے کا بھول جائے
اور ایسے لمحے میں اپنے آنسو چھپا کے رکھنا، کمال یہ ہے

خیال اپنا، مزاج اپنا، پسند اپنی، کمال کیا ہے؟
جو یار چاہے، وہ حال اپنا بنا کے رکھنا، کمال یہ ہے

کسی کی رہ سے، خدا کی خاطر، اٹھا کے کانٹے، ہٹا کے پتھر
پھر اس کے آگے، نگاہ اپنی جھکا کے رکھنا، کمال یہ ہے

وہ جس کو دیکھے تو دکھ کا لشکر بھی لڑکھڑائے، شکست کھائے
لبوں پہ اپنے، وہ مسکراہٹ، سجا کے رکھنا، کمال یہ ہے

تبصرہ کتب

نسرین خان

BOUNDARIES OF THE SOUL

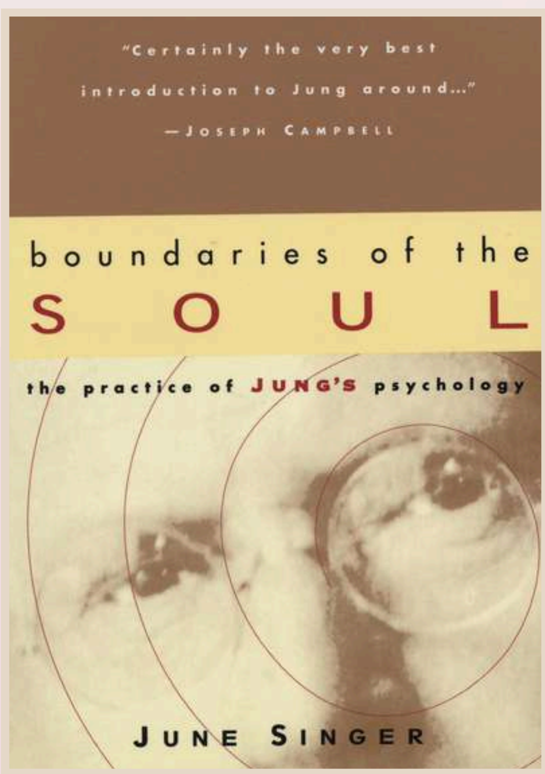

کتاب کا عنوان:
Boundaries of the Soul

مصنفہ:
June Singer

موضوع:
یونگی نفسیات (کارل گوستاو یونگ کے نظریات پر مبنی)
پہلی اشاعت: ۱۹۷۲

ناشر:
Doubleday & Co

"انسان کی اصل عظمت یہ ہے کہ وہ اپنی روح کی آواز کو سنے اور دوسروں کی روح کی خاموشی کا احترام کرے۔"
(کارل یونگ اور جون سنگر کے افکار سے ماخوذ)

یہ تبصرہ میرے اس تعلیمی سفر کا حصہ ہے جو میں "تھیراپی ورکس" میں نفسیات کی طالبہ کے طور پر طے کر رہی ہوں۔ اس سفر میں ہمیں کچھ منتخب کتب مطالعے کے لیے دی گئیں، جن میں سے ایک اہم اور بصیرت افروز کتاب Boundaries of the Soul تھی۔ یہ کتاب میرے لیے گہرے فکری ارتقاء اور ذاتی آگہی کا ذریعہ بنی۔

مجھے محسوس ہوا کہ ایسے قیمتی نکات کو صرف اپنے تک محدود رکھنا ناانصافی ہوگی، اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ان افکار کو سادہ اور عام فہم انداز میں قارئین تک پہنچایا جائے تاکہ ہماری سوسائٹی میں روح اور ذات کی حدود کے بارے میں شعور پیدا ہو۔

ڈاکٹر جون سنگر کی یہ کتاب یونگی نفسیات کو سلیس انداز میں بیان کرنے والی ایک نمایاں تصنیف ہے۔ اس میں انسانی نفس، لاشعور، خوابوں کی تعبیر، انا، اور روحانی ارتقاء جیسے اہم موضوعات پر سادہ مگر مؤثر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنفہ نے کارل یونگ جیسے گہرے مفکر کے پیچیدہ خیالات کو عام قاری کے لیے قابلِ فہم اور قابلِ عمل بنادیا ہے۔

یہ کتاب خاص طور پر ان افراد کے لیے نہایت مفید ہے جو نفسیات، روحانیت اور خود شناسی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

کارل گوستاو یونگ بیسویں صدی کے عظیم ماہرِ نفسیات اور فلسفی تھے، جنہوں نے انسانی شخصیت کی پیچیدگیوں کو نہایت گہرائی سے جانچا اور اسے محض ایک سادہ یا بیمار نفسیاتی وجود کے بجائے ایک مکمل شعوری ہستی قرار دیا۔ ان کے نزدیک انسان کا شعور اور لاشعور ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، اور جب انسان اپنے باطن سے جڑتا ہے تو وہ اپنی حقیقی "خودی" کو دریافت کرتا ہے۔

یونگ کا سب سے مؤثر نظریہ "انفرادیت کے عمل" کا ہے —— یعنی انسان کی یہ مسلسل جدوجہد کہ وہ اپنی اصل ذات کو پہچانے، اسے قبول کرے اور مکمل کرے۔ ان کے نزدیک انسان کی شخصیت محدود دائرے میں قید نہیں بلکہ ایک مسلسل ارتقاء پذیر حقیقت ہے۔ ڈاکٹر جون سنگر نے انہی خیالات کو اپنی اس کتاب میں نہایت دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ ایک معروف ماہرِ نفسیات اور یونگی طرزِ علاج کی ماہر تھیں، جنہوں نے کارل یونگ کے تصورات کو عوام الناس تک مؤثر انداز میں پہنچایا۔

Boundaries of the Soul یونگی نفسیات کی ایک دلکش اور عالمانہ تشریح ہے۔ یہ کتاب اس بات پر زور دیتی ہے کہ انسان کی روح اور ذات کی اپنی حدود ہوتی ہیں، جیسے جسمانی حدود ہوتی ہیں۔ اگر انسان ان حدود کو پہچانے اور ان کا احترام کرے تو وہ نہ صرف اپنی داخلی دنیا سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ بہتر تعلق بھی قائم کر سکتا ہے۔

کتاب کا مرکزی پیغام یہ ہے کہ انسان کی بیرونی شخصیت، یعنی وہ چہرہ جو وہ دنیا کو دکھاتا ہے، اور اس کی اندرونی حقیقت، یعنی اس کا باطن —— ان دونوں کے درمیان ایک نازک مگر ضروری توازن ہونا چاہیے۔ اگر ہم صرف

بیرونی شخصیت میں گم ہو جائیں اور اپنے باطن کو نظرانداز کریں، یا صرف داخلی دنیا میں محو ہو کر دنیاوی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جائیں، تو یہ ہمارے ذہنی و روحانی توازن کے لیے مضر ثابت ہوتا ہے۔

جون سنگر کے مطابق ایک کامیاب اور متوازن زندگی وہ ہے جس میں انسان اپنی روحانی حدود کا احترام کرتے ہوئے دوسروں کی حدود کو بھی تسلیم کرے۔ یہاں "حدود" کا مفہوم صرف جسمانی یا جذباتی دائرہ نہیں بلکہ شعور، روح، آزادی اور باہمی احترام کا ایک وسیع تصور ہے۔ یہ کتاب ہمیں سکھاتی ہے کہ:

- ہر فرد کی اپنی نفسیاتی اور روحانی جگہ ہوتی ہے، جس کا احترام ضروری ہے۔
- اپنی ذات سے جڑنے کا عمل محض علمی نہیں بلکہ شعوری بیداری کا ثمر ہوتا ہے۔
- دوسروں کی حدود کا احترام، درحقیقت، اپنی ذات کی توقیر ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں انفرادی حدود کے تصور کی شدید کمی ہے۔ ہم نہ صرف دوسروں کی نجی زندگی میں مداخلت کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات اپنے اصول دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کتاب ہمیں ایک بہتر، باشعور اور متوازن سماج کی تشکیل کے لیے سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک کتاب نہیں بلکہ ایک داخلی سفر ہے—اپنی روح کی وسعت کو پہچاننے اور دوسروں کی روح کا وقار سمجھنے کا نام ہے:

Boundaries of the Soul

یہی فہم، یہی بیداری، انسانی رشتوں کو مضبوط، بامعنی اور دیرپا بناتی ہے۔

ڈرامے پر تبصرہ

تبصرہ: ثوبیہ نورین

اڑان

مصنف: عمیرہ احمد

ڈائریکٹر: یاسر نواز

فن کار: آمنہ شیخ، ہمایوں سعید، صبا قمر

پروڈکشن: ایور نیو پروڈکشن

ریلیز: جیو انٹرٹینمنٹ چینل

ڈرامے پر تبصرہ

"اُڑان"۔۔۔یہ عنوان ہی ایک ایسا دلکش احساس ہے جو اُن لوگوں کے دلوں کو چھو لیتا ہے جو حدود و قیود سے ماورا سوچ رکھتے ہیں۔اگر آپ ایک حساس، باشعور اور ذی فہم فرد ہیں تو اس ڈرامے کا منفرد اور پُر اثر بیانیہ آپ کو آغاز ہی میں اپنی جانب متوجہ کر لے گا۔یہ محض ایک ڈرامہ نہیں بلکہ ایک احتجاج، ایک سوال، اور ایک دعوتِ فکر ہے۔

ڈرامے کا ابتدائی مکالمہ کچھ یوں ہے:

"میں بات کروں گی ان موضوعات پر جن پر آپ بولنا نہیں چاہتے، جن پر خاموشی کا ٹوٹنا بہت ضروری ہے، میں اُٹھاؤں گی وہ مسائل جو بعض کے لیے طنز ہیں اور بعض کے لیے تنازع۔ عورت کے لیے شادی فریب ہے یا خیال۔۔۔"

یہ مکالمے فقط تمہید نہیں بلکہ مصنفہ کے فکری انقلاب کا پیش خیمہ ہیں، جہاں وہ معاشرے میں مکالمے کی نئی ثقافت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔اس ڈرامے میں عورت کے بنیادی حقوق اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو جس جرأت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، وہ ہمارے معاشرتی رویوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

یہ ڈرامہ اُن والدین کی سوچ پر بھی سوال اُٹھاتا ہے جو اپنی بیٹیوں کو اپنے خوف اور اندیشوں کے سبب ایسی تربیت دیتے ہیں جو درحقیقت ان کے لیے قید بن جاتی ہے۔بیٹیوں کو ایسے گھروں میں بیاہ دینا جہاں وہ اپنی شناخت، وقار اور حتیٰ کہ وجود تک گنوا بیٹھیں، صرف اس لیے کہ "گھر بسا رہے"، دراصل سب سے بڑی ناانصافی ہے۔

ڈرامہ یہ بھی پوچھتا ہے کہ تعلیم یافتہ، پیشہ ور، باوقار اور سنجیدہ نظر آنے والے افراد آخر کیوں نفسیاتی اور جسمانی تشدد جیسے بدترین جرائم میں ملوث پائے جاتے ہیں؟ اور وہ کون سے گہرے زہریلے رویے ہیں جو معاشرتی پردوں کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں اور جنہیں عام لوگ پہچان نہیں پاتے؟

یہ سوال بھی اُٹھایا گیا ہے کہ بظاہر خود مختار اور کامیاب مرد شادی کے بعد کیسے کٹھ پتلی بن جاتے ہیں، اور ان کے فیصلے کس طرح اُن ذہنی سانچوں اور ماضی کے زخموں کے غلام ہوتے ہیں، جن سے وہ کبھی باہر ہی نہیں نکل پاتے۔

"اڑان" مایوسی میں مبتلا کر دینے والا ڈرامہ نہیں ہے۔یہ امید، ہمت اور خود اعتمادی کی دعوت دیتا ہے۔یہ بتاتا ہے کہ ایک عورت کیسے ظلم اور محبت کے ملے جلے عذاب سے نکل کر اپنی ذات کو از سرِ نو تعمیر کر سکتی ہے۔

مصنفہ نے "خواتین کی خود مختاری"، "حساس موضوعات"، "مساوات"، "تعلیم" اور "پیشہ ورانہ زندگی" جیسے موضوعات کو کسی نظریاتی شدت پسندی کے بغیر، متوازن انداز میں پیش کیا ہے۔مکالموں کے ذریعے سے ناظرین کو خود سوچنے اور سوال اُٹھانے پر مجبور کیا گیا ہے۔

ڈرامے کا ایک قابلِ غور پہلو وہ ماں ہے جو تنہا اپنی اولاد کی پرورش کرتی ہے۔ جب وہی ظالم شوہر ایک روز ندامت کا لبادہ اوڑھ کر واپس آتا ہے تو اولاد کیا کرے؟ ایسے لمحوں میں ایک عورت اپنے وقار، صلاحیت اور حوصلے کو پہچان کر اپنے بچے کا مستقبل کیسے محفوظ بناتی ہے، یہ دیکھنا ہر فرد، خاص طور پر خواتین کے لیے ناگزیر ہے۔

والدین کے لیے بھی اس ڈرامے میں کئی سبق ہیں ــــ یہ کہ تعلیم یافتہ ہونا اچھی پرورش کی ضمانت نہیں، اور یہ کہ ناکام تربیت کس طرح پورے خاندان کو برباد کر سکتی ہے۔

ڈرامے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اگر والدین کی شادی فقط معاشرتی دباؤ، یا نفرت کی بنیاد پر ہوئی ہو تو اس کا زہر نسلوں میں کیسے سرایت کرتا ہے۔

نینا اور جواد کی جوڑی اس نکتہ کو اجاگر کرتی ہے کہ محبت بھری شادی بھی غلط فہمیوں اور خاموشیوں کی نذر ہو سکتی ہے، لیکن باہمی فہم و فراست اور نرمی سے اس میں رنگ بھرے جا سکتے ہیں۔

اور آخر میں، اس ڈرامے کی سب سے چونکا دینے والی پرت وہ ہے جس میں ایک شدید نفسیاتی مریض کے رویوں کو دکھایا گیا ہے ــــ ایسے لوگ جو ہماری معاشرت میں عام انسانوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں مگر در حقیقت ایک مجسم خطرناک عارضہ ہوتے ہیں۔

یہ ڈرامہ اُن نشانیوں کی پہچان سکھاتا ہے جو کسی مرد یا عورت کے ذہنی بیماری کی خبر دیتی ہیں۔ ظاہری کشش، شائستگی یا محبت میں لپٹے سلوک کے پیچھے چھپے زہریلے رویے کیسے شناخت کیے جائیں، یہ بات ہر ذی شعور کو جاننی چاہیے۔

آخری سین، جس میں ڈاکٹر فراز کی ماں کا مکارانہ رویہ دکھایا گیا ہے، ناظر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے:

کیا ایسے لوگ واقعی کبھی بدلتے ہیں؟ کیا ان کے زخم بھر سکتے ہیں؟ کیا انہیں معافی ملنی چاہیے؟

یہ ڈرامہ اُن تمام افراد کے لیے ایک بیداری ہے جو رشتوں کی خوشنمائی میں چھپے زہر کو پہچاننا اور خود کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

مرتب: وجیہہ حسان واحدی

نامے جو میرے نام آئے!

یہ قارئین کے برقی خطوط اور پیغامات ہیں جو انھوں نے ہمیں ارسال کیے۔
قارئین و سامعین اس پتے پر اپنی آراء، تجاویز اور تحریریں اس برقی پتے پر بھیج سکتے ہیں: آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی بھیج سکتے ہیں۔

Salihaat@almawridus.org

سنگاپور سے عظمیٰ

لکھتی ہیں کہ میں برسوں سے اکیبانہ کے ارینجمنٹ سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ ان کی خوبصورتی اور ان کی انفرادیت کی تعریف ایک لمحے میں کیسے کروں؟ وہ اپنے اندر جیسے ایک وسیع معنی خیز احساس کو لپیٹے ہوئے ہو۔ ثمین کے اس مضمون نے مجھے اکیبانہ کو ایک بہت ہی مختلف نقطہ نظر سے دیکھنے پر مجبور کیا ہے۔اس آرٹ میں بہت گہرائی اور روحانیت ہے۔

جنت، انسانی خواہش اور دنیا کی نمائندگی کرنے والے عناصر کے درمیان توازن۔ با معنی خالی پن (شاید اس چیز کی عکاسی کرنا جو ہمارے پاس اس دنیا میں نہیں ہے) سب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی میں ہیں اور ایک خوبصورت مکمل بناتے ہیں۔

ہماری زندگیوں کی طرح۔ ہمارے ہر چیلنج، ہماری صلاحیتیں اور ہماری خواہشات کی انفرادیت... کیا یہ توازن اور خوبصورتی ہماری زندگی میں بھی پیدا کرنا ممکن ہے؟ قرآن میں ہے:

اور اللہ خوبصورتی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(بقرہ 195)

اکیبانہ ایک الہام ہے، ایک امید ہے کہ ہاں! ایک خوبصورت توازن پیدا کرنا ممکن ہے! شاید ہماری نامکمل ذاتیں، ہماری آرزوئیں اور یہاں تک کہ جو ہم سوچتے ہیں کہ ہماری زندگی میں غائب ہے، ہم سب مل کر اس اللہ کی اسکیم میں ایک مقصد پورا کرتے ہیں۔

اکیبانہ کی دنیا کے بارے میں اتنی خوبصورت اور فکر انگیز بصیرت کے لئے ثمین کا مکرر شکریہ۔

بحرین سے نزہت فاطمہ

لکھتی ہیں:

محترمہ نورالہدیٰ شاہ کا تحریر کردہ مضمون انوکھی معافی نہ صرف ایک اثر انگیز تحریر ہے بلکہ اس میں ہر فرد کے لیے بہترین رہنمائی ہے۔ مصنفہ نے اپنے مشکل ترین حالات میں اپنے رب کو ہی یاد کیا۔ نماز میں اپنے رب سے ہی فریاد کرتی رہیں اور اس فکر اور جستجو میں رہیں کہ ان سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔ مومن کی پہچان یہی ہے کہ کوئی تکلیف اور پریشانی میں کسی اور سے گلے شکوے کے بجائے یہ غور کرے کہ کہیں وہ کوئی گناہ تو نہیں کر بیٹھا ہے۔ مصنفہ کے اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ کس طرح انہوں نے حالات کی ستائی ہوئی ایک لڑکی کی اور اس کے دو بچوں کی مدد کی۔ ان بچوں کے اچھے مستقبل کی خواہش میں اس طرح ذہنی اور قلبی طور پر محو ہو گئیں کہ نیکی کرتے کرتے ایک نیک صفت خاتون کی انجانے میں دل آزاری کر بیٹھیں۔

اس واقعے سے ایک بہت اہم سبق یہ ملتا ہے کہ بے شک نیکی کریں، لوگوں کے کام آنا ہے، ضرورت مندوں کی مدد کرنی ہے، لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک فرد کی مدد کرتے ہوئے کسی دوسرے فرد کی حق تلفی نہ ہو جائے، کسی دوسرے پر ظلم نہ ہو جائے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ہم نیکی کر رہے ہوتے ہیں اور نیکی کے زعم میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک کے ساتھ نیکی کرتے ہوئے دوسرے کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ نیکی کرتے ہوئے لاشعوری طور پر انسان کے اندر تکبر کا جذبہ پنپنے لگتا ہے اور یہ تکبر کی بدترین قسم ہے۔ اس واقعے سے

یہ رہنمائی ملتی ہے کہ جب کسی معاملے میں دو فریق ہوں تو دونوں فریقین کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے، لحاظ رکھنا ہے، بہت زیادہ محتاط رہنا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ مصنفہ کو جیسے ہی اپنی غلطی کا ادراک ہوا انہوں نے پھر اس کی تدارک میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔اس مقام پر پڑھنے والے پر بھی رقت سی طاری ہو جاتی ہے کہ اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے وہ سب کچھ انہوں نے کر لیا جو ان کی بساط میں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کا مان رکھا، نہ ان کی عزت و وقار میں کمی آنے دی اور نہ ہی انہیں مایوس کیا-اور مصنفہ کو ان خاتون سے بھی محبت اور عزت ملی۔ مصنفہ نے توجہ دلائی ہے کہ حقوق العباد کا معاملہ کتنا اہم ہے اور غلطی ہو جائے تو معافی مانگنا اور اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا بھی اتنا ہی اہم۔یہ نہیں کہ حج کی روانگی کے موقع پر ایک معافی کا میسج سوشل میڈیا پہ لگا دیا یا شب برات کے موقع پر معافی کا میسج پوسٹ کر دیا۔شب برات کی تو ویسے بھی دینی لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں ہے۔اپنے بر صغیر میں لوگوں نے شب قدر کی اہمیت اور فضیلت کو شب برات سے منسلک کر دیا ہے۔

بہر کیف مصنفہ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رسمی معافی تلافی ایک خوش فہمی ہے۔معافی یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنے رب سے معافی طلب کرے پھر اس بندے سے معافی مانگے جس کی کسی بھی لحاظ سے دل آزاری یا حق تلفی کی گئی ہو، اگر کسی کا مال کھایا ہو تو اس کا ازالہ کرنا ہو گا کرنا ہو گا۔آخر سطروں میں مصنفہ نے ایک بہت اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے جو موتیوں سے تولنے کے لائق ہے

یعنی ان کا یہ جملہ انسان کو ہلا دینے کے لیے کافی ہے کہ "نیکی کرنے کا تکبر انسان کو سزا کا مستحق بناتا ہے"۔اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ ہم سب کو ایسی تمام باتوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں جو انسان کو سزا کا مستحق بناتا ہے۔

محمد کامران خالد، میلسی پاکستان سے

لکھتے ہیں: نعیم بلوچ صاحب! آپ کا مضمون بڑی توجہ سے پڑھا، دل چسپ اور ادبی پیرائے میں لکھا گیا۔آپ نے ملکہ سبا کا کردار نہایت اچھے انداز سے پیش کیا، میں نے اس سے قبل ملکہ سبا سے متعلق اس پہلو سے کوئی تحریر نہیں پڑھی۔بلقیس نام کی وجہ تسمیہ سے متعلق بھی پہلی بار کوئی ایسی بات نظر سے گزری۔

عامر یزدانی، ایم فل، اسلامی افکار و تہذیب: ڈیلس امریکا سے لکھتے ہیں:

صالحات کے مطالعے کا موقع ملا، جو ایک نہایت خوبصورتی سے ترتیب دیا گیا مجلہ ہے، جو ہر سہ ماہی شائع ہوتا ہے اور

جس کی بنیاد قرآنی اقدار پر رکھی گئی ہے۔اس مجلہ کی ادارت مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی خواتین نہایت سنجیدگی اور فکری شعور کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔یہ ایک قابلِ تحسین کاوش ہے جو متنوع موضوعات کو یکجا کرتی ہے ـــــ قرآن مجید کی تعلیمات پر مبنی فکری نکات ہوں یا معاشرتی مسائل اور ذرائع ابلاغ میں معاشرے کی عکاسی پر بصیرت افروز مباحثے، ہر پہلو کو نہایت سلیقے سے پیش کیا جاتا 'صالحات' اس بات کی مستحق ہے کہ اس کا دائرۂ اشاعت اور حلقۂ قارئین مزید وسیع ہو، کیونکہ اس کے ذریعے خواتین کو اپنے اپنے شعبوں میں بامقصد کردار ادا کرنے اور فکری و عملی سطح پر مثبت حصہ ڈالنے کی تحریک ملتی ہے۔

میں دل کی گہرائیوں سے دعاگو ہوں کہ یہ مجلہ کامیابی کی نئی منزلیں طے کرے اور اس کے جملہ منصوبے بفضلِ خداوندی کامیاب ہوں۔

شمس سلیمان پاکستان سے لکھتے ہیں:

یہ میگزین بہت پروڈکٹیو ہے۔اللہ آپ لوگوں کو اجر عطا فرمائے۔بہت متاثر کن کام ہے۔میں انڈیا اور پاکستان کے بیشتر اداروں کے رسالے پڑھتا ہوں۔ لیکن کہیں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو خاص طور پر خواتین کے لیے وقف ہو۔

ثوبیہ نورین حسن ابدالسے لکھتی ہیں:

زکوٰۃ کا مضمون مختصر مگر بہت جامع ہے۔مختلف نقطہ نظر کو اکٹھا کر کے خلاصہ بھی دے دیا اور اپنی آرا بھی۔ یہ اسلوب اچھا ہے کہ عام قارئین کو ٹھوس نصوص یا مختلف تعبیرات کے ساتھ ساتھ موجودہ مسائل کا حل بھی مل سکے۔آج کے دور میں جب علمی شعور بہت پست ہو چکا ہے، وہاں سادہ اور عام فہم تحریر کی اشد ضرورت ہے۔

کراچی سے ثوبیہ شاہد زبیری لکھتی ہیں

"کوڈنگ اور ڈجیٹل اسکلز کے ذریعے امکانات کو کھولیے" آپ کا یہ آرٹیکل بہت ہی شاندار ہے۔میں بھی یہ سمجھتی ہوں کہ آج کے دور میں ہر لڑکی اور ہر عورت کو کوئی نہ کوئی ڈجیٹل اِسکلز آنے چاہییں اور یہ تو اب سوشل میڈیا اور

تاثرات

آن لائن کورسز کی وجہ سے بہت آسان ہو گیا ہے کہ ہم اپنے موجودہ اسکلز کو انہانس کریں۔ آج ہر عورت اپنے آپ کو بااختیار بنا سکتی ہے۔ بہت ضروری ہے کہ یہ آرٹیکل سب لڑکیاں پڑھیں اور اس بات کو سمجھیں کہ آج یہ بہت اہم ہے کہ وہ بچوں اور گھر داری کے ساتھ ساتھ اپنے اسکلز کو بڑھائیں اور ایک بہتر زندگی گزاریں۔